بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروانی سیریز نمبر ۲

نتیجۂ افکار جناب ... حسین

المقبول

یعنی

ان مضامین کا مجموعہ

جو

محمد مقتدی خان شروانی بلوزی

نے

اردو کے مختلف اخبارات اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً لکھے

مع [illegible] مضامین کے

بماہ ستمبر ۱۹۰۹ء

مطابق

شعبان المعظم و رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ

حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور میں چھپا

ملنے کا پتہ:- محمد مقتدی خان

منیجر شروانی ایجنسی لاہور

قیمت ۱۲ آنے علاوہ محصول

ان خیالات کو نہایت ادب کے ساتھ اپنے والد ماجد

جناب محمد مستجاب اللہ خانصاحب مقبول

کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں

تاریخ طبع رسالۂ ھذا از حضرت ممدوح

نام سے صاحب رسالہ (مؤلف) کے — عین اللہ جب ہوئی واصل

محمد متقند سے خان = ۱۲۹۷ — ل = ۳۰

بے کم و کاست پھر تو اے مقبول — سال تالیف ہو گیا حاصل

سنہ ۱۳۲۷ھ

"شروانی سیریز"

وہ دو لفظ ہیں جن پر بسم اللہ کہکر کتاب ہاتھ میں لیتے ہی ناظرین کی نظر پڑے گی اس لیے ان کی توضیح ضروری سمجھتا ہوں۔

شروانی پٹھانوں کا ایک خاندان ہے۔ جو اگرچہ ہندوستان کے بعض دوسرے مقامات میں بھی آباد ہے لیکن اس کا بڑا حصہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے اضلاع علی گڈھ وایٹہ میں ہے۔

خاندانی شجرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے بانی افغانستان سے ہندوستان بسلسلۂ ملازمت فوج سلطان سکندر لودی کے عہد (۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۷ء) میں آئے تھے۔ فوج سے نکلکر انہوں نے زراعت شروع کی۔ اور اس وقت چار سوا چار صدیاں گذرنے کے بعد خدا کے فضل سے ان کی اولاد لاکھوں روپیے کی زمین داریوں کی مالک ہے۔ اور جن اسلاف کا قبضہ صرف تیغ آہن پر تھا۔ ان کے اخلاف رشید دولت وعلم کا میدان مارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خاندان شروانی کے بعض افراد فرید کی شہرت گو ہندوستان کے ہر گوشہ میں بلکہ اس سے باہر تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ من حیث المجموع اس خاندان کے نام سے بہت ہی تھوڑے کان آشنا ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ جن پھولوں کی یہ مہک ہے۔ وہ کس چمن کی مشک آگین خاک سے اُگے ہیں۔

اس کے ایک ادنیٰ جزو ہونے کی حیثیت سے مجھے عرصہ سے اپنے عزیز خاندان کی شہرت کو وسعت دینے کا خیال تھا۔ اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ لفظ "شروانی" کو پبلک کے سامنے لانے کا کوئی موقع میں نے ہاتھ سے جانے دیا ہو۔ بااین ہمہ کوئی ایسا ذریعہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جس سے یہ لفظ جلد جلد زبانوں پر آتا رہے۔ اور شہرت پائدار حاصل کرے۔

اسی فکر کے زمانہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے مقصود کو مجسم کر کے میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک روز بمقام بلوٹہ (ضلع علیگڈھ) چند اعزا جمع تھے۔ اور مولانا شبلی نعمانی کے "النامہ" (المامون۔ الفاروق الغزالی۔ الکلام۔ الندوہ وغیرہ وغیرہ) کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ میرے عم محترم جناب محمد سمیع اللہ خانصاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "الشروانی" کے

نام سے بھی کوئی اخبار یا رسالہ جاری ہونا چاہیئے۔ یہ محض ایک چلتی ہوئی بات تھی
جو آئی گئی ہوئی۔ ایک ہی منٹ بعد کسی کو اسکا خیال بھی نہ تھا۔ مگر "الشروانی"
کا لفظ میرے لئے ایسا نہ تھا جو ہوا پر اُڑ جاتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ گویا کہ
مدت دراز کی کوئی کھوئی ہوئی چیز۔ جبکہ اس کے ملنے سے مایوسی ہو چلی تھی۔ ہاتھ آگئی
لیکن اس خیال کو عملی صورت میں لانا مجھ جیسے بے مایہ شخص کے لئے ممکن نہ تھا۔

اس کے بعد ایک اور کم خرچ تجویز میرے ذہن میں آئی۔ جس کے متعلق میں نے بعض
سربرآوردہ اصحاب (شروانی) کی خدمت میں عریضے لکھے۔ بعض حضرات نے ازراہ
کسر نفسی میری استدعا نامنظور کی۔ بعض نے اپنی خاموشی ہی کو میرے خطوط
کا بہترین جواب سمجھا۔ غرض یہ تجویز یوں ہی ٹھکرا کر رہ گئی۔ کیونکہ اس کا پورا ہونا جملہ
اصحاب کی عملی تائید پر منحصر تھا۔ لیکن ایک دو بزرگوں نے میری درخواست سے
نہ صرف قولی بلکہ فعلی ہمدردی کی۔ اور انھی کی دلسوزی کے یقین نے مجھے مایوس
نہیں ہونے دیا۔

اب میں نے "شروانی سیریز" کے نام سے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ
کیا ہے۔ جسکا پورا کرنے والا صرف خدا ئے قادر ہے۔

مجھے اس امر کے اظہار میں خاص مسرت ہے کہ اس سلسلہ کا

ڈیڈیکیشن

عالیجناب خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خان صاحب رئیس بھیکن پور
(ضلع علیگڈھ) جن کی علم دوستی محتاج بیان نہیں۔ اپنے نام نامی پر منظور فرمایا ہے۔
اور چونکہ میں جناب ممدوح کو کل سر سبد شروانیان اور قوم کا عمدہ اور خلاصہ سمجھتا ہوں
اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے "شروانی سیریز" کو کل قوم کے نام پر معنون
کیا ہے۔ خان بہادر ممدوح کو میں ناظرین سے انٹروڈیوس کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

حسبی اللہ ونعم الوکیل ط نعم المولٰی ونعم النصیرہ

فہرستِ مضامینِ المقبول

المقبول

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ

گزارش

یہ اوراق جن کو میں پبلک میں پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ میرے نثر مضامین کا مجموعہ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ملک کے بعض سربرآوردہ اخبارات و رسائل میں شایع ہوئے ہیں۔

ان میں بہت سے مضمون ایسے ہیں، جو ایک جگہ چھپنے کے بعد بغیر میری تحریک کے۔ متعدد جگہ نقل ہوئے۔ اکثر مضامین کی نسبت بعض ایسے اصحاب نے پرائیویٹ طور پر میری ہمت افزائی کی جن کے اظہار پسندیدگی کو میں تحسین ناشناس ہرگز قرار نہیں دے سکتا۔

اگرچہ کئی مضمون نقل در نقل ہونے کی حالت میں بالکل مسخ ہو گئے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کو ہر وہ مضمون نگار جو مضمون تیار کرنے میں کوشش و کاوش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا ہو افسوس کی نگاہ سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن اس سے کم از کم اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ میری ناچیز تحریر مقبول ہوئی اور بحمد اللہ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ؎

کس وقت میں ہم چھوٹ کے آئے عدم آہ
جب اٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے
(وانیں)

یہی خیال ہے۔ جس نے مجھے امید دلائی ہے کہ اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ خصوصاً جبکہ نظرِ ثانی کے وقت مضامین کے اندر خیالات ومعلومات اور تصاویر کا معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ جو مضامین دائمی دلچسپی کے نہ تھے انہیں بشمول نظموں کو شامل نہیں کیا گیا۔ اور آخری تین مضامین ایسے ہیں۔ جو اب تک شایع نہ ہوئے تھے۔ غرض یہ یقین کرنے کی کافی وجہ موجود ہے۔ کہ بحیثیت مجموعی یہ کتاب تمام ناظرین کے لئے انشاء اللہ تعالےٰ دلچسپ ثابت ہوگی۔

مجموعۂ ہذا کے مضامین کی قسم وار تفصیل یہ ہے:۔

اخلاقی وادبی	۹۵۸
علمی	۲۴
تاریخی	۸

لیکن قبل ازیں کہ مضامین نقل کروں یہ بتا دینا بھی غالباً موجب دلچسپی ہوگا کہ

میں نے مضمون نگاری کس طرح شروع کی

کیونکہ ممکن ہے کہ بعض دوسرے مضمون نگار صاحب کو اپنی مضمون نویسی کے تجربات کو اس سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے اور وہ معلوم کرسکیں۔ کہ اس معاملہ میں مختلف طبایع کا رنگ کیا ہوتا ہے؛

میری پیدایش (جس کو تیس سال گزرے) ایک ایسے زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ ہندوستان کی اخبار نویسی (علی الخصوص اردو اخبار نویسی) نہایت ابتدائی اور پست حالت میں تھی۔ اردو میں روزانہ اخبارات اور علمی رسالوں کا پتہ نہ تھا۔ چند ہفتہ وار اخبار تھے جن کی قیمتیں آج کل کے دیکھتے بہت چڑھی ہوئی تھیں لیکن بہرکیف متوسط الحال لوگ بھی ان کو خریدتے تھے امداً انہی میں سے دو تین اخبارات میرے مولد ومسکن دہلو ضلع علیگڈھ حرسہا اللہ عن آفات الزمن) میں خرید سے جاتے تھے؛

مجھے اخبارات اور کتابوں کے مطالعہ کا شروع ہی سے شوق تھا چنانچہ

۱۰ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ ۸ اگست ۱۸۸۹ء کو والد ماجد مدظلہ نے ایک مذہبی
رسالہ جو مجھے بطور انعام دیا تھا اس پر تحریر فرمایا تھا:—

"آج دسویں ذی الحجہ یوم پنج شنبہ کو بطور امتحان یہ لکچر برخوردار
محمد مقتدی خاں طول عمرہ سے پڑھوایا گیا۔ استعداد کے موافق
صاف اور واضح بلا اٹکنے کے پڑھا ...... یہ بات صرف
برخوردار کے ذاتی شوق اور کثرت اخبار بینی سے ہے۔ الخ"

میں جب کتابوں اور اخبارات کے مضامین کو پڑھتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ ان کا لکھنا صرف مافوق الانسانی قوت کا کام ہے۔ دل میں امنگ پیدا ہوتی
تھی کہ کاش میں بھی ایسے مضامین لکھ سکتا۔

اوائل ۱۸۹۷ء میں جب کہ پنڈت لیکھرام کے قتل کا اخبارات میں چرچا
رہتا تھا۔ علی گڑھ کی لائل لائبریری میں ایک آریہ اخبار میری نظر سے گزرا جس میں
"خون ناحق" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ
اس قتل کا مجرم مسلمانوں کو گردانا گیا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر میری جو حالت
ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کا جواب لکھوں۔ سینہ میں
جوش تھا۔ دماغ پر خیالات کا ہجوم تھا۔ گھبرایا۔ دوات قلم سنبھالی۔ مضمون
کا عنوان "الزام ناحق بجواب خون ناحق" قایم کیا۔ اب اس سے آگے کچھ لکھنا
چاہتا ہوں تو الفاظ یاری نہیں کرتے۔ کئی دن کی کوشش سے صرف چھ
سات سطریں لکھی گئیں۔ ایسے بے مایہ مضمون کے ساتھ اپنا نام لکھنے
کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ اور اسے یوں ہی بادل ترساں اخبار "تہذیب"
کو بھیج دیا جو اس زمانہ میں علی گڑھ سے نکلتا تھا۔ خدا جانے مضمون چھپا
یا نہیں لیکن جو جوش تھا اس کو وہی چند سطریں ٹھنڈا کر چکی تھیں۔

اس کے بعد جناب مولانا سید وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی نے
مجھے ترجمہ کی مشق کی ترغیب دی۔ اور کئی بار میرے ترجمے کی خود اصلاح فرمائی۔
اسی اثنا میں میں نے اڈیسن کے ایک مضمون کا ترجمہ کیا۔ مگر وہ کئی برس
پڑا رہا اور کسی اخبار یا رسالہ میں اس کے بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔

آخر جب جنوری ۱۹۰۶ء میں بسلسلۂ ملازمت پیسہ اخبار لاہور آیا۔ تو ایڈیٹر صاحب انتخاب لاجواب نے اس مضمون کو اپنے ہاں شایع کیا۔ یہ "اعتدال" کے عنوان سے اس مجموعہ کے سب سے پہلے نمبر پر درج ہے۔

اب الٹا سیدھا جیسا ہو سکتا ہے ٹٹول ٹٹول کر کچھ لکھ لکھا دیتا ہوں۔ کوئی مجھے "مولوی" کہتا ہے کوئی "ماسٹر" مگر درحقیقت میں نہ منشی ہوں نہ مولوی۔ نہ مسٹر نہ ماسٹر۔ وہی مثل ہے کہ پڑھے نہ لکھے نام میاں محمد فاضل۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ

المناغات

یہ "شروانی سیریز" کی چوتھی کتاب ہے۔ جس میں دنیا کے اکثر ملکوں علی الخصوص ہندوستان اور اردو زبان کی لوریاں جمع کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی مختلف ممالک کے بچوں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ آخر میں پرورش اطفال کے متعلق نہایت مفید ہدایات درج کی گئی ہیں۔ اردو زبان میں اب تک ایسی دلچسپ کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ کتاب با تصویر ہے۔ اور اس کی خوبی صرف دیکھنے پر منحصر۔ قیمت فی جلد بارہ آنے (۱۲/) مع محصول ڈاک۔

القرض

"شروانی سیریز" کی اس پہلی کتاب میں قرض گیری کی برائیاں۔ قرض سے مبرّا ہونے کی خوبیاں۔ قرض ادا کرنے کی آسان تدابیر اور روپیہ جمع کرنے کی ترکیبیں بتائی گئی ہیں۔ قابل دید کتاب ہے۔ جس کو پبلک نے بے حد پسند کیا ہے۔ قیمت دو آنے (۲/) علاوہ محصول ڈاک۔ المقبول کے خریداروں سے ایک آنہ (۱/) مع محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

محمد مقتدیٰ خاں شروانی منیجر شروانی ایجنسی لاہور

ا

اعتدال

ازملفوظات ایڈیسن[1]

الف لیلیٰ میں ایک بادشاہ کا قصہ لکھا ہے۔ کہ وہ عارضہ فساد خون میں مبتلا تھا بہت سا علاج معالجہ کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک طبیب نے اس کا علاج ذیل کے طریقہ سے کیا۔ اس نے ایک لکڑی کی گیند کو اندر سے خالی کر کے اس میں دوائیں بھریں۔ پھر اس کو ایسی حکمت سے بند کیا کہ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح چوگان میں بھی دوائیں بھریں۔ اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جہاں پناہ علی الصبح ان کی ورزش کیا کریں۔ یہاں تک کہ خوب پسینہ آجایا کرے۔ اس تدبیر سے بادشاہ کا مرض بہت جلد علاج پذیر ہوگیا۔ حالانکہ اس پر اندرونی معالجے بے سود ثابت ہو چکے تھے۔ یہ مشرقی تمثیل ہم کو ورزش جسمانی کی قدر کرنا سکھاتی ہے۔ نیز یہ کہ ورزش جسم کے واسطے بہت ہی مؤثر دوا ہے۔ اس تمثیل سے میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ورزش انسانی جسم کے واسطے از بس مفید ہے۔ آگے چل کر میں تندرستی قائم رکھنے کا دوسرا طریقہ بیان کروں گا جو بہت سی حالتوں میں ورزش کا حکم رکھتا ہے۔ اور اس حالت میں جبکہ ورزش کا موقع نہ ملے۔ اس کی قائم مقامی کر سکتا ہے۔ وہ طریقہ جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ "اعتدال" ہے۔ جو تندرستی کے دوسرے ذریعوں پر فوق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس پر ہر طبقہ اور ہر حالت کے لوگ عمل کر سکتے ہیں۔ ہر موسم میں اور ہر جگہ۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس پر ہر شخص بغیر اس کے کہ کام میں خلل واقع ہو یا وقت اور روپیہ کا نقصان ہو کاربند ہو سکتا ہے۔ اگر ورزش فضلات کو تحلیل کرتی ہے تو اعتدال ایسی مفید شے ہے کہ وہ ان کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا۔ اگر ورزش نالیوں کو صاف کرتی ہے۔ تو اعتدال ان کو غلیظ ہی نہیں ہونے دیتا۔ اگر ورزش جسم میں مناسب حرارت پیدا کرتی اور دوران خون کو ترقی دیتی ہے تو اعتدال قدرتی قوتوں کو موقع دیتا ہے کہ اصلی طاقت سے کام کریں اگر ورزش

---

[1] یوسف ایڈیسن انگریزی زبان کا مشہور ادیب ہے۔ ولادت ۱۶۷۲ء وفات ۱۷۱۹ء۔

بڑھتے ہوئے جسمانی نقصان کو روکتی ہے تو اعتدال گویا ان کو بھوکوں مار ڈالتا ہے۔

طب زیادہ تر اعتدال اور ریاضت کی قائم مقام ہے۔ اور یہ درحقیقت صرف اُن امراض کے لئے ضروری ہیں جو تندرستی کے ان دو بڑے ذرائع (ریاضت اور اعتدال) کے سست اثر کا انتظار نہیں کر سکتے لیکن اگر ریاضت اور اعتدال کو لازم قرار دے لیا جائے تو ان امراض کے لئے بھی پھر بہت کم موقع رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے وہ حصے زیادہ تندرست ہیں۔ جہاں بسر اوقات شکار ہی پر ہے۔ نیز یہ کہ اس زمانہ میں جب کہ انسان کا گزارہ محض شکار پر تھا۔ اور شکار کے علاوہ دوسری قسم کی غذا بہت کم ملتی تھی۔ آدمی بہت عرصہ تک زندہ رہتے تھے۔ پلستر لگانا۔ پچھنے لگانا فصد کھولنا۔ اور اسی قسم کے دیگر معالجات صرف کاہلوں اور بداعتدالوں کے واسطے ہیں اور دوائیں ان لوگوں کا علاج ہیں جو تندرستی کو عیش و آرام کا ذمہ دار جانتے ہیں۔ (اطبا ہمیشہ باورچیوں اور مے فروشوں کی بیخ کنی میں مصروف رہتے ہیں یعنی دواؤں کے ذریعہ سے صرف ان امراض کا علاج ہوتا ہے جو کھانے پینے کی بے اعتدالی اور کثرت مے نوشی سے پیدا ہوتی ہیں۔ مترجم)

حکیم دیوجانس[1] کلبی کی نسبت کہا گیا ہے کہ ایک مرتبہ راہ میں اسے ایک دوست ملا جو کسی دعوت میں شریک ہونے کے لئے جا رہا تھا۔ دیوجانس نے اس کو وہیں پکڑ لیا اور گھر لے لیا۔ گویا اگر اس کو روکا نہ جاتا تو وہ بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے۔ جب کہ دنیا کی ہر چیز نہایت سادہ حالت میں تھی۔ پس اگر اس فلاسفر کے اس وقت یہ خیالات تھے۔ تو اس زمانہ کے امرا کے دسترخوان کی شان و شوکت کی نسبت وہ کیا کچھ نہ کہتا۔ وہ یقیناً ایسے لوگوں کو دیوانہ خیال کرتا جن کے دسترخوان پر ہر قسم کے میوہ جات۔ ترکاریاں۔ مربّے اور پرند کے کباب ہوتے ہیں۔ تمام قوتیں اپنی اصلی حالت پر اسی وقت رہ سکتی ہیں۔ جب سادہ اور ہلکی غذا کا استعمال ہو۔ سوائے انسان کے ہر حیوان ایک ہی قسم کی غذا پر قانع ہوتا ہے۔ اس نوع کی خوراک سبزی ہے

---

[1] دیوجانس یونان کا مشہور فلاسفر ہے سنہ ۴۱۲ ق.م پیدا ہوا۔ تنہائی پسند اس قدر تھا کہ جب کوئی اس کے پاس جاتا۔ تو دیوجانس کتے کی طرح ٹانگ لیتا۔ اسی وجہ سے کلبی (منسوب بہ کلب یعنی کتا) کے لقب سے ملقب ہوا۔ ۱۴۹۷

اس کی مچھلی۔ اور تیسری کی گوشت لیکن انسان ہر چیز پر جو اس کے سامنے آ جائے۔ جھک پڑتا ہے؛

یہ ناممکن ہے کہ اعتدال کا کوئی معین قاعدہ بتایا جا سکے۔ کیونکہ جو چیز ایک کے واسطے بے اعتدالی ہے۔ وہی دوسرے کے لئے عین اعتدال ہے لیکن ایسے لوگ قریب قریب معدوم ہیں۔ جو اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ کونسی چیز ان کی جسمانی حالت کے مناسب ہے۔ اور کونسی چیز اُن کے مزاج کے مخالف ہے۔ اگر میں اپنے ناظرین کو مریض فرض کروں۔ تو ان کے سامنے ایک بڑے تجربہ کار حکیم کا یہ قول پیش کرونگا کہ "ایک ہی قسم کا کھانا کھاؤ۔ اگر دوسری قسم کا بھی کھاؤ۔ تو جب تک کھانا ختم نہ کر لو۔ کوئی اشتہا پیدا کرنے والی شے استعمال نہ کرو۔ تمام قسم کی چٹنیوں کا استعمال چھوڑ دو۔ یا کم از کم ان کا جو اپنی ترکیب میں نہایت ہی سادہ اور ہلکی نہ ہوں" اگر آدمی ان چند سادہ اور سہل قواعد کی پابندی کرے تو اس کو بے اعتدالی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا پہلی حالت (ایک ہی قسم کا کھانا کھانے۔ مترجم) کا تو یہ نفع ہے کہ کوئی ایسی چیز موجود نہ ہوگی جس سے بے اعتدالی کا خیال پیدا ہو سکے۔ اور دوسری کا یہ فائدہ ہے کہ اشتہائے کاذب پیدا نہ ہوگی۔ اگر میں شراب خواری کے قواعد منضبط کروں تو وہ ایک قابل قدر مصنف کے اس قول کے موافق ہونگے "پہلا جام میرے لئے۔ دوسرا میرے دوستوں کے لئے۔ تیسرا سرور کے واسطے۔ چوتھا میرے دشمنوں کے واسطے" (یعنی پہلا جام چنداں مضر نہیں ہوتا۔ دوسرے سے دوستانہ رغبتوں کا اُبھار ہوتا ہے۔ تیسرے جام پر سرور گھٹتے ہیں۔ چوتھا جام بالکل دیوانہ بنا دیتا ہے۔ مترجم) لیکن ان حکیمانہ قواعد کی پابندی اس شخص کے لئے۔ جو سطح زمین پر ہے۔ ناممکن ہے اس لئے جسمانی حالت کی مناسبت سے اعتدال کے کچھ دن مقرر کر لئے جائیں اس طرح مقررہ ایام طبیعت کو بہت کچھ مدد دینگے کیونکہ طبعی حالات میں جو کچھ زیادتی ہو جائیگی۔ اس زیادتی کو یہ رفع کرتے رہینگے اور طبیعت کو اس قابل بنا دینگے کہ جب کبھی سوء مزاجی یا سوء اتفاق واقع ہو تو وہ بھوک پیاس پر غالب آ سکے۔ قدیم زمانہ کے دو تین مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ اس مہلک با[5]

---

[5] سنہ ۴۳۰ قبل مسیح میں یونان کے اندر ایک خوفناک وبا نمودار ہو کر مصر و حبش تک پھیل گئی تھی

میں جس کا ذکر ہر زمانہ میں کثرت سے ہوا ہے۔ سقراط[1] حکیم ایتھنز[2] ہی میں تھا مگر اس پر وبا کا بالکل اثر نہیں ہوا اور یہ محض اس اعتدال کی وجہ سے تھا جس کو وہ ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا۔ اس جگہ میں اس مشاہدہ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میں نے اکثر فلسفیوں اور بادشاہوں اور امرا کی زندگی کا مقابلہ کرکے کیا ہے۔ اگر ہم ان فلسفیوں کی زندگی کو غور کی نگاہ سے دیکھیں جن کے فلسفہ کا بڑا حصہ معتدل طرزِ معاشرت کی ہدایت کرتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ایک فلسفی اور ایک معمولی آدمی کی زندگی کی دو تاریخیں ہیں۔ (یعنی فلاسفر بوجہ اعتدال ملحوظ رکھنے کے زیادہ عمر پاتے ہیں اور معمولی آدمی بہ سبب بے اعتدالیوں کے کم زندہ رہتے ہیں جس سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفر اپنے مقابل سے قدیم تر زمانہ کا ہے جب کہ عمریں عموماً زیادہ ہوتی تھیں۔ مترجم)

اعتدال کی کامل مثال لوئی کارنارو[3] ہے جو شہر وینس[4] کا باشندہ تھا۔ اس سے بہتر اعتدال کی مثال گزشتہ چند صدیوں میں غالباً کسی نے قایم نہیں کی ہوگی۔ وہ پورے سو برس زندہ رہا اور ایک کتاب اس مضمون پر تصنیف کی جس کے تین چار ایڈیشن خود اس نے نکالے اور جو اس وقت تک یورپ کی قریب قریب ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ [انتخاب لاجواب مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۰۲ء]

---

[1] سقراط یونان کے مشاہیر حکما سے ہے۔ ولادت ۴۶۹ ق م وفات ۳۹۹ ق م۔ ایک بت تراش کا بیٹا تھا اس کی اخلاقی تعلیم سے متاثر ہو کر کثیر التعداد آدمی اس کے پیرو ہو گئے تھے مگر حکومت نے اس کی تعلیم کو مخرب اخلاق قرار دیا۔ اور زہر پلا کر مار ڈالا۔ جو اس زمانہ میں سزائے موت کا ایک طریقہ تھا۔ ۱۲۹۷

[2] ایتھنز یونان کا پایہ تخت اور دنیا کا نہایت قدیم شہر ہے ۱۶۶۴ ق م تک اس کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے ۱۲۹۷

[3] لوئی کارنارو شہر وینس کا ایک امیر تھا۔ معتدل طرزِ معاشرت اور اس کی حمایت و اشاعت کے لئے مشہور تھا ولادت ۱۴۶۷ء وفات ۱۵۶۶ء ۱۲۹۷

[4] اٹلی میں کم و بیش دو لاکھ کی آبادی کا ایک شہر ہے موجودہ شہر کی بنیاد ۴۵۲ء کی ہے ۱۲۹۷

۲

ہمارے ذاتی اور ملکی فرائض

(انگریزی سے ترجمہ)

اس امر میں کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا کہ ہر مرد اور ہر عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ صرف اپنے ہی فوائد کو مدنظر نہ رکھے بلکہ اپنے متعلقین یعنی خاندان کا بھی خیال رکھے۔ لیکن ہمارا ملک بھی تو بجائے خود ایک خاندان ہے اور ہم سب اس خاندان کے رکن ہیں۔ اس لئے ہر مرد و زن کو یاد رہے کہ اپنے ملک کے فوائد کا لحاظ رکھنا ان کا فرض اور ایسا فرض ہے جو تمام دوسرے فرائض پر مقدم ہے۔ مگر ہمیں یہ نہ خیال کرنا چاہئے۔ کہ اپنے ملک کے فوائد اور اس کی بہتری کو پیش نظر رکھنے سے ہم خود اپنے خاندانی یا اپنے ذاتی اغراض سے غافل ہونے کے خطرہ میں پڑ جائینگے۔ نہیں۔ اگر ہم اپنے اور اپنے خاندانی فرائض کو کماحقہٗ سمجھیں اور ان پر کاربند ہوں تو یہ عین ملک کی خدمت ہے۔

جس وقت نیلسن[1] نے ایک معرکۂ[2] عظیم کے موقع پر انگریزی بیڑہ کے ملاحوں کے سامنے تقریر کی تھی۔ تو اس کے یہ الفاظ تھے "انگلستان کو ہر شخص کی ذات سے توقع ہے کہ وہ اپنے فرض کو انجام دیگا" یہ الفاظ معمولی دنیاداری اور روزمرّہ کی زندگی کی کشمکش پر بھی جس کا ہم کو مقابلہ کرنا ہے پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک ہر باشندہ سے۔ عام اس سے کہ وہ انگلینڈ کا باشندہ ہے یا ویلز کا۔ اسکاٹلینڈ کا ہے یا آئرلینڈ کا۔ امید کرتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوشش کریگا۔ یہی اصول مختلف اقطاع عالم کے مسلمانوں اور مختلف حصص ہند کے باشندوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے (مترجم) اگر اپنے ملک۔ اپنے خاندان اور اپنے ذاتی فوائد کے حاصل کرنے میں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی قابلیتوں کا نہایت موزوں استعمال کریں۔ یعنی خدا کی عطا کردہ

---

[1] و [2] ہوریشیو نیلسن انگلستان کا سب سے بڑا امیر البحر ہے۔ ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا اور ۲۱ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو فرانس و اسپین کے متحدہ بیڑے کے مقابلہ میں بمقام ٹریفالگر راس واقع جنوبی اسپین گولی کھا کر مارا گیا مگر وہ نپولین اعظم کی بحری قوت کو گولی لگنے سے پہلے توڑ چکا تھا۔ معرکۂ عظیم سے مراد جنگ ٹریفالگر ہے۔

جسمانی اور دماغی قوتوں کو کام میں لائیں۔ اور ان کے کام میں لانے کے موقعوں کو جو پیش آئیں۔ ہاتھ سے نہ جانے دیں ؛

یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر مرد اور عورتیں اپنے آپ کو کارآمد بنانا چاہتی ہیں تو بچپن ہی کے زمانہ سے اس امر پر غور کرنا شروع کر دیں کہ ان کو کیا کرنا چاہئے ؟ اس کا سب سے پہلا اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم وہی کام اختیار کریں جو ہماری طبیعت کے مناسب ہو ؛

یہ امر تو مسلمہ ہے کہ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ اس وجہ سے جو بات نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم وہی کام کریں جس کو ہم اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ کون کہ سکتا ہے کہ ایک شخص۔ جو مادرزاد کوچبان ہے۔ اور جو گھوڑوں کے متعلق ہر کام کو نہایت خوبی سے انجام دیتا ہے۔ راستی پر ہے اگر وہ کلرک بن جاتا ہے اور دن بھر فہمیں جوڑتا اور خطوط نقل کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بہ نسبت دفتر کے کام کے گھوڑوں ہی کا کام کچھ اچھی طرح کر سکتا ہے ؛

اور لیجئے ایک شخص ہے۔ جس کے بازو مضبوط ہیں۔ اور اس کو ہتوڑے کے استعمال کا ڈھب بھی خوب آتا ہے۔ وہ اپنی اور ہم سب کی خدمت اسی صورت میں اچھی طرح کر سکتا ہے کہ لہار کا پیشہ اختیار کرے نہ اس صورت میں کہ درزی بنجائے اس کے دو بین ثبوت ہیں۔ اول تو یہ کہ جو شخص جس کام کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ اس کو وہ آسانی اور عمدگی سے کرتا ہے اور جس کام کے لئے موزوں نہیں ہوتا اس کو بری طرح اور بدقت کرتا ہے۔ اور خوشی و قناعت بھی اسی کام سے حاصل ہوتی ہے جس کو ہم اچھی طرح کر سکیں ؛

تو اب وہ لڑکا یا لڑکی۔ جو ابتدائے زندگی ہی سے اپنے مناسب حال کام اختیار کرنے کا لحاظ رکھے اس کا بہ نسبت اس لڑکے یا لڑکی کے زیادہ خوشی خرمی اور قناعت کی زندگی بسر کرنا اغلب ہے جس کو ان باتوں کی مطلق پروا نہیں اپنے مناسب طبع کام انتخاب نہ کرنے سے ہم اپنا ہی نقصان کرتے ہیں ؛

دوسرے جو لوگ مناسب طبع کام کرنے کی بجائے غیر مناسب طبع کام کرتے ہیں وہ اپنے ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک خاندان کے

حق میں پر کس قدر نقصان رساں ہے کہ مریم سے برتن منجھوائے جائیں۔ جو سینے پرونے میں تو طاق ہے۔ مگر برتن بہت ہی برے مانجھتی ہے یا یہ کہ جبین سے کپڑے دھلوائے جائیں جو کھانا نہایت عمدہ پکاتی ہے مگر کپڑے بالکل نہیں دھو جانتی یا ولیم سے کوچبانی کرائی جائے۔ جو دوکانداری کے کام میں بھلے بھلوں سے کم نہیں ؛

بعینہ یہی حال قوم کا ہے۔ اگر سارے اہل ملک وہ کام کرنے لگیں جس کے لئے وہ کسی طرح موزوں نہیں ہیں تو یہ اس بڑے خاندان یعنی قوم کے لئے بہت ہی برا ہے اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ حتی الامکان اپنے لئے مناسب طبع کام انتخاب کرے ؛

کچھ شک نہیں کہ ہر لڑکے۔ لڑکی مرد اور عورت کے لئے یہ لازمی نہیں کہ اس کو ہمیشہ وہی کام مل سکے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ ایسی صورت میں ان کا فرض ہے کہ جو کام ملے اس کو لیں۔ کوئی شخص جو حقیقتاً ذی شعور ہے اس وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا رہیگا۔ کہ کوئی ایسا کام نہیں ملتا جو اس کی رائے میں موزوں ہے۔ موزوں کام اختیار کرنا تو اسی حالت میں ممکن ہے کہ مختلف قسم کے کام پیش نظر ہوں اور انتخاب کا موقع بھی ہو۔ کاہل وجود لوگ تو اپنے دل میں خیال کرتے ہیں کہ کوئی ایسا کام ملے جس میں محنت بالکل نہ ہو اور جب جی چاہے اس کو چھوڑ دیں۔ مگر ایک ہونہار اور دور اندیش نوجوان اپنے دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ وہ کونسا کام ہے جس سے مجھے بالطبع لگاؤ ہے ؟۔ پس مبارک ہے وہ شخص خود اپنے لئے اپنی قوم کے لئے۔ اپنے ملک کے لئے جس کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوں اور جو فیصلہ بھی انھی کے مطابق کرے۔ [انتخاب لاجواب مورخہ ۴ جون ۱۹۰۲ء]

۳

عادات

(ٹاڈز اسٹوڈنٹ مینوئل سے ترجمہ)

کہا جا سکتا ہے کہ سارے اخلاق انسانی کا مفہوم لفظ عادات میں شامل ہے اس لئے یہ کہنا چنداں بعید از حقیقت نہیں کہ انسان مجموعۂ عادات ہے۔ فرض کرو تمھیں مدت العمر کے لئے گلے میں آہنی طوق اور گھٹنے پر زنجیر پہننے کے واسطے مجبور کیا جائے تو کیا اپنی زندگی کا ایک ایک دن اور گھنٹہ گھنٹہ تمہیں بھاری نہ ہو جائیگا؟ صبح کو اٹھتے ہو تو اپنی زنجیر کی قید میں ہوتے ہو۔ آخر اس بوجھ سے تھک کر رات کو پڑ رہتے ہو۔ یہ خیال اور بھی گراں گزرتا ہے کہ اس بلا سے نجات پانے کی کوئی صورت ہی نہیں لیکن پھر بھی بعض انسانی عادات کے مقابلہ میں یہ بالکل ناقابل برداشت نہیں اور نہ ان چیزوں سے بریت حاصل کرنا دشوار ہے؛

عادات انسان کو بہت جلد دامنگیر ہو جاتی ہیں اور خصوصاً وہ جو بُری ہوں آ جو کام آج خفیف معلوم ہوتا ہے وہی بہت جلد طبیعت میں راسخ ہو جائیگا اور تمہیں رسّی کی طرح مضبوط جکڑ لے گا۔ تم کو یاد ہوگا کہ وہی رسّا جو ایک ایک تار بٹکر بنایا گیا ہے اس کے آگے طاقتور سے طاقتور جہاز اپنا سر جھکاتا اور اس کی قوت کے مقابلہ میں اپنے زور کو ہیچ سمجھتا ہے۔ ہر شخص میں کسی نہ کسی طرح کی عادت تو ضرور ہوتی ہے۔ اس کے افعال اس کے خیالات اس کے جذبات ایک خاص روش پر ہوتے ہیں خواہ اچھی ہوں یا بُری یہ عادتیں خود اس کا ایک جزو بنکر ایک قسم کی طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہیں کون نہیں جانتا کہ ایک بڈھے کو جس نے اپنی عمر کے ساٹھ سال ایک ہی اپنے مکان میں ایک ہی اپنے آتش دان کے کسی خاص گوشہ پر بیٹھ کر گزار دئے ہوں نقل مکان کس قدر شاق گزریگا۔ کون ہے جس نے باسطیل[1] کے بڈھے قیدی کی رہائی کا قصہ

---

[1] Bastille نامی پیرس میں ایک محبس تھا جس میں قیدیوں کو بہت اذیت ہوتی تھی فرانس میں جیل خانوں کی اصلاح کے بعد توڑ دیا گیا؛ ۱۲۹۷

نہیں پڑا جس نے التجا کی تھی "کہ مجھے میرے تنگ و تاریک محبس میں پھر واپس بھیجدیا
جائے کیونکہ وہاں کی عادتیں ایسی مستحکم ہو گئی ہیں کہ میری فطرت ان کے ترک سے
بالکل قاصر ہے"۔ غالباً چالیس سال کی عمر کا شخص بھی تم کو کوئی ایسا نہ ملیگا جس کو
اپنی عادتوں کا رونا نہو۔ جو اس کی مفید ذات پر ایک معیوب دھبّا ہیں۔ لیکن جو اس
کی طبیعت میں ایسی شیر و شکر ہو کر سمائی ہیں کہ بیچارہ ان کی بندشوں کو توڑ ہی نہیں
سکتا یا کم سے کم اس میں کوشش کی ہمت ہی نہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی کسی خاص
عادت کے ضرور پابند ہو گے۔ ایسا ہی چاہیئے۔ وہ انسان بھی کیا جس کے ساتھ کچھ
عادات مخصوص نہ ہوں لیکن میری یہ غرض ہے کہ تم میں وہی عادتیں ہونی چاہئیں
جو عمدہ ہوں اور جن سے تمہاری خوشی خرمی میں ساعت بساعت اور روز بروز اضافہ
ہو۔ اگر کسی شخص سے کہا جائے کہ جو کلہاڑی تم اس وقت پسند کر لوگے عمر بھر تم کو
وہی استعمال کرنی پڑے گی تو کیا وہ یہ احتیاط نہیں کریگا کہ ایسی کلہاڑی انتخاب
کرے جو متناسب اور لوہے کھیری سے درست ہو۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ اس
قسم کے لباس کا تم کو مدت العمر کے لئے پابند ہونا پڑیگا تو کیا وہ لباس کی وضع قطع کا
مطلق لحاظ نہ کرے گا۔ مگر مفروضہ صورتوں میں یہ باتیں بہ نسبت ان عادتوں
کے انتخاب کے کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں جن کے مطابق روح کو عمل کرنا ہے
روح کو بد عادتوں میں مبتلا کر کے اس سے کسی اچھے یا بڑے کام کی توقع رکھنا
ایسا ہی ہے جیسا کہ حد سے زیادہ تنگ چست کپڑا پہنکر یہ امید کرنا کہ اب جسم اپنے
فرائض کو خوبی اور آسانی سے انجام دے سکیگا کوئی عمدہ عادت اختیار کرنے میں کسی
قسم کا خوف دل میں نہ لاؤ کیونکہ جتنا ابتداءً خیال کرتے ہو اس کی نسبت ان عادتوں
کے تم زیادہ آسانی سے خوگر ہو سکتے ہو اُسی بات یا اُسی کام کو روزمرہ معینہ وقت پر
کرو۔ بس اس ترکیب سے وہ کام بہت جلد مرغوب اور تمہاری عادت میں داخل ہو جائیگا
اس کی مطلق پروا نہ کرو کہ ایک کام ابتدا میں سخت معلوم ہوتا ہے صرف اس کو روز
مرّہ مقررہ وقت پر کچھ دن تک بلا ناغہ کئے جاؤ۔ بس تمہاری طبیعت کو اس سے مناسبت
ہو جائے گی۔ ہماری ساری عادتوں کی یہی ایک اصل ہے۔ اس موقع پر میں ان عادتوں
کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دوں گا جو میری رائے میں طالب علموں کے لئے نہایت

مفید ہیں اور ساتھ ہی ان کے اختیار کرنے کے متعلق خاص خاص ہدایتیں دینے کی بھی کوشش کرونگا۔

روزمرہ کے کام کا پہلے سے تعین کرلو

کام کا تعین پختگی سے گزشتہ شام کو کرلو۔ صبح اُٹھکر اس پر ایک نظر ڈالو اور فوراً اس کے مطابق کام کرنا شروع کردو۔ نہایت تعجب کی بنا ہے کہ پہلے سے تعین کر لینے سے دن میں بہت زیادہ کام ہاتھ سے نکل جاتا ہے (اور عمر آخر اس چیز سے مرکب ہے؟) ہر کام کا یہی اصول ہے۔

انتھک محنت کے عادی بنو

اگر بدقسمتی سے تم اس گمان میں ہو کہ میں ذہین ہوں اور کام خود بخود آجائیگا تو بہتر ہے جتنا جلد ممکن ہو اپنے آپ کو اس دھوکہ سے نکال لو یہ بات دل میں اچھی طرح ٹھان لو کہ جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتے ہو بس اسکی قیمت ایک محنت ہے اُس قیمت کو فوراً ادا کرنا شروع کردو۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کو محنت سے انجام دینا بڑے بڑے مقاصد کا نہایت کامیاب دیباچہ ہے۔ تنہا محنت اور کوشش نے بڑے بڑے حیرت انگیز نتیجے پیدا کئے ہیں۔ اگلے لوگ جو ضخیم ضخیم کتابیں لکھا کرتے تھے ان کو دیکھ کر آج ہمیں حیرت ہوتی ہے لیکن ایک لفظ محنت سارے اسرار کی کنجی ہے۔ ڈاکٹر جانسن[۱] کا قول ہے کہ جو شخص اپنی پوری قوت سے تین گھنٹے روز چلتا رہے گا وہ سات سال میں اتنی مسافت طے کرے گا۔ جو کرۂ ارض کے دور کے برابر ہے۔" طالب علم کے لئے کوئی حالت سستی سے زیادہ خراب اور اس سے زیادہ اس کے عادت مضر نہیں اور ساتھ ہی کاہلی سے زیادہ کوئی اور خصلت اتنی ناچھی اور بطی الخروج نہیں ہے کاہل آدمی چند ہی روز میں بالکل بے حس ہو جاتی ہے اور پھر اس کا یہ مسلک ہو جاتا ہے "دوڑنے سے آہستہ چلنا اچھا ہے۔ اس کان تہ چپ چاپ کھڑا رہنا ہے۔ بیٹھا رہنا اس سے بھی بہتر ہے اور پھر لیٹ جان تو کیا ہی بات ہے۔" غالباً سب سے زیادہ واجب الرحم وہ شخص ہے جو حد سے زیادہ سست ہو کیونکہ "کہتے ہیں دیوانگی میں کچھ وہ لذتیں ہیں جن کا ادراک دیوانے ہی کو خوب ہوتا ہے۔ اسی طرح بلاشبہ کاہلی میں بھی وہ وہ..... مصائب ہیں جن کا احساس صرف کاہل وجودوں کو ہوسکتا ہے۔" میں جانتا ہوں کہ بہت لوگ ایسے بھی ہیں جن کو مصروفیت تو بہت کچھ ہے مگر پھر بھی وہ محنتی نہیں۔ کیونکہ یہ

[۱] ملاحظہ ہو نوٹ صفحہ ۲۲۔

ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص باوجود نہایت جلدباز اور متلون مزاج ہونے کے محنتی کے درجہ سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ "مہربانی کرکے فرمائیے"۔ مارکوئس آف اسپنولا[له] نے سرہارس[ا] دیر سے پوچھا۔ "آپ کا بھائی کس مرض سے مرا؟" سرہارس نے جواب دیا۔ "جناب لبس بے کاری اس کا مرض الموت تھا"۔ یہ سن کر اسپنولا نے ایک آہ سرد بھری اور بولا کہ "ہم میں سے ہر جنرل کے مار ڈالنے کے لئے یہی کافی دوائی ہے"۔ مشہور ہے کہ محض اس بڑے شخص کے طرز بیان سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ڈماستھینز نے تھیوسیڈائڈیز کی تاریخ کو خاص اپنے قلم سے آٹھ بار نقل کیا تھا۔ دو ضرب الامثال ہیں۔ ایک ترکی اور دوسری اسپینی۔ جن میں حقیقت کا بہت کچھ حصہ شامل ہے۔ "محنتی آدمی پر تو ایک اور کاہل آدمی پر ہزاروں شیطان مسلط ہوتے ہیں"۔ "بالعموم آدمی شیطان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ لیکن کاہل آدمی از خود شیطان کو اپنے عمل کی ترغیب دیتا ہے"۔ اگر محنت کو لازم قرار دے لو۔ تو بتاؤ تم ہر روز کتنی ایک مخرّب اخلاق صحبتوں۔ غلط کاریوں کے خیالات اور ایسے موقعوں سے بچو گے جو تمہاری نیک نامی کے لئے خطرناک اور تمہارے دوستوں کی عافیت میں خلل انداز ہوں گے:۔

استقلال کی | استقلال سے میری مراد ایک کام کو مناسب تدابیر کے ساتھ مستعدی سے ایک مدت تک جاری رکھنا ہے۔ بعض لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب [کسی کی] نسبت سنتے یا کسی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ اس کو فلاں تدبیر اختیار [کرنے سے بڑ]ی کامیابی ہوئی تو خود بھی اس پر کاربند ہونے کے لئے فوراً آمادہ ہو جاتے [ہیں۔ کچھ] دن تک تو اندھا دھند اس کو کئے جاتے ہیں اور اس کی تعریف بھی کرتے [ہیں۔ مگر آ]خر اس کو چھوڑ کر کوئی اور کام کرنے لگتے ہیں۔ پہلے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ

روح کو
ایسا ہی
فرالیضر
قسم کا
کے
کرو

ا۔ اسپینی جنرل متوفی سنہ ۱۶۳۰ء ۱۲-۹۷-۶

ب۔ انگریزی جنرل متوفی سنہ ۱۶۳۵ء ۱۲-۹۷-۶

ج۔ حکماء یونان سے ہے ۳۲۲ ق م میں فوت ہوا ۱۲-۹۷

د۔ یونانی مورخ المتوفی ۴۰۱ ق م ۱۲-۹۷

فلاں بڑے آدمی نے چونکہ یہ کام کیا تھا آؤ ہم بھی اسی کام کو کریں لیکن جیسا کہ ہر نئے کام کا قاعدہ ہے اس میں تھوڑی سی بھی مشکل پیش آتی ہے تو فوراً چھوڑ بیٹھتے ہیں ۔

مثال کے طور پر ایک طالب علم کو لو۔ وہ قدیم زبانوں کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اتنے میں ایک دوست آتا ہے اور اسے نصیحت کرتا ہے کہ "تم اپنے وقت کو ضائع کر رہے ہو اور یہ کہ بجائے ان متروک الفاظ اور بوسیدہ ہڈیوں کے کیا اچھا ہو اگر تم نئے خیالات کے اکتساب میں مصروف ہو" وہ اپنی تجویز کو بدل کر ریاضی کی مشق شروع کرتا ہے اب کوئی اور دوست آتا ہے اور سنجیدہ اور معقول صورت بنا کر اس سے پوچھتا ہے "کیا آپ کو کسی کالج کا پروفیسر بننا ہے اگر نہیں تو پھر آپ اپنے وقت کا بے جا استعمال کر رہے ہیں۔ روزمرہ کی کارروائی کے لئے معمولی ریاضی دانی بالکل کافی ہے" وہ اپنی اقلیدس پھینک دیتا ہے اور کسی اور فن کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اپنے بارے میں کسی اتنے ہی معقول مشورہ پر ترک کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح منصوبوں کے رد و بدل میں عمر تمام ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے طرز عمل کی مضرتوں کو تم بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جس کا بد اثر یہ ہے کہ مزاج میں تلون پیدا ہوتا ہے جو بجائے خود کامیابی کی دل فریب دل آویز امیدوں پر پانی پھیر دینے کے لئے کافی ہے ۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس استقلال اور مستعدی سے لوگوں نے اپنے ان مقاصد کی کوشش کو جاری رکھا جن کی دھن اور پھر جن کا حصول ان کی عظمت کا باعث ہوا۔

چارلس دوازدہم بادشاہ سویڈن المتوفی ۱۷۱۸ء اپنی سلطنت کے اکثر حصوں میں دورہ اس طرح کیا کرتا تھا کہ چوبیس گھنٹے تک متواتر گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا تھا اس کے سارے افسر ماندگی سے بالکل خستہ حال ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر بالکل یکہ و تنہا سفر کیا کیا کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ گھوڑا اس کی سواری ہی میں مر کر گر پڑا۔ مردہ گھوڑے پر سے زین اتار شہنشاہ بے تکلف چار جامہ اور پستولیں پیٹھ پر لاد کر چل دیا۔ قریب کی سرائے میں دیکھا کہ اصطبل میں ایک گھوڑا بندھا ہوا ہے اور حسب دل خواہ بھی ہے فوراً اس پر زین کس کر سوار ہو گیا۔ سرائے سے نکلا ہی تھا کہ مالک نکل آیا اور للکار کر مال چرانے کا سبب دریافت کیا۔ شہنشاہ نے جواب دیا کہ میں نے گھوڑا اس واسطے لیا ہے کہ چار جامہ خود اپنی پیٹھ پر لادے لادے تھک گیا ہوں۔ اس جواب سے مالک بھلا کب مطمئن ہونے والا تھا نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں طرف سے تلواریں کھنچ گئیں اور اگر شاہی گارڈ آ کر مالک کو اطلاع دیتے کہ تیری تلوار شہنشاہ کے مقابلہ میں اٹھی ہوئی ہے تو کشت و خون ہو ہی چکا تھا جس تندہی سے حوصلہ مند چارلس

اپنی تدابیر پر عمل پیرا ہوتا تھا اس کا یہ ایک ادنےٰ نمونہ ہے یہی استقلال تقریباً ہر طالب علم کو چند ہی سال میں بلند مراتب پر پہنچا سکتا ہے ؎

پابندی اوقات کے عادی بنو

کوئی شخص ایسا موجود نہیں جو وقت کا پابند نہ ہو لیکن پھر بھی ایسے لوگ چند ہی ہیں جو کسی کام میں وقت کی کماحقہ پابندی کرتے ہیں۔ درس گاہ میں تھوڑی دیر سے پہنچنا یا ہر کام تھوڑی دیر سے کرنا نسبتہً نہایت آسان ہے مستعد اور پابند ہونا اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس خصلت کے فوائد خود تمہارے اور دنیا کے لئے بے اندازہ ہیں جو شخص وقت کا پابند ہے وہ دوسرے کی نسبت کم سے کم دوگنا کام خود اتنی ہی آسانی اور اطمینان سے انجام دے سکتا اور اس سے اتنا ہی دوسروں کو مطمئن کر سکتا ہے۔ سابق لارڈ چانسلر انگلستان ہنری[1] بروہم باوجودیکہ ایک سلطنت کا بھاری بوجھ اس کے سر پر تھا وہ ہاؤس آف لارڈس اور کورٹ[2] آف چانسری کا میر مجلس ہوتا اور بیرسٹروں کو روزمرہ درس دیتا۔ ریویو لکھنے اور کم سے کم دس ایسی انجمنوں کا صدر ہونے کے واسطے وقت نکالتا تھا جو علوم مفیدہ پر کتابیں شایع کرتی تھیں، وقت کا اتنا پابند تھا کہ جب مجالس منعقد ہوتیں تو ہمیشہ عین وقت مقررہ پر پہنچکر صدر میں جگہ لیتا تھا۔ ہم فطرۃً اور عادۃً اتنے سست اور بے فکر ہیں کہ ایسے شخص کو دیکھ کر جو حقیقۃً اور بالاستقلال وقت کا پابند ہو ہم اس فعل کو عیش پسندی پر محمول کرتے ہیں۔ ہم ایسے شخص پر بھروسا کرنے کے دلدادہ اور اس قسم کے اسٹاف کو تقریباً ہر قیمت پر خریدنے کے لئے آمادہ ہیں۔ کم ازکم اس سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا ہے۔ بعض لوگ اس عادت کو اختیار کرنے سے ڈرتے معلوم ہوتے ہیں کہ مبادا یہ ایک ایسی خصلت کی حد تک پہنچے جو ناشائستہ اور ایک عالی ہمت کے حوصلہ اور ایسے شخص کی نظروں سے گری ہوئی ہو جس میں ان پر کاربند ہونے کے لئے اعلےٰ تر خصائل موجود ہیں۔ کیا بلیکسٹن[3] کی ہمت ادنےٰ درجہ کی تھی؟

---

[1] ایک کامیاب برٹش مقنن اور سوشل رفارمر المتوفی ۱۸۶۸ء ۔ ۱۲۹۷

[2] یہ پیشتر پارلیمنٹ سے دوسرے درجہ پر انگلستان کی سب سے بڑی عدالت تھی اب ہائیکورٹ آف جسٹس کی ایک شاخ ہے

[3] سر ولیم بلیکسٹن المتوفی ۱۷۸۰ء انگلستان کا مشہور مقنن اور جج تھا ۱۲۹۷

کیا اس نے پابندی اوقات کی عادت اس لئے اختیار کی تھی کہ ان پر بھروسا کرنے کے لیئے اس میں اور اعلیٰ اخلاقی خصوصیات تھیں؟ تاہم جس زمانہ میں وہ اپنے مشہور لیکچر دے رہا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے اپنے سامعین کو ایک منٹ بھی منتظر رکھا ہو اور نہ اس کا خیال ایسے شخص کی نسبت کبھی اچھا کہا جا سکتا تھا جو اس صفت سے موصوف نہ ہونے میں بدنام ہو۔ ناظرین غالباً مسٹر بروڈی کی نسبت ذیل کا بیان پڑھکر خوش ہونگے جو آخری عمر میں انجیل مقدس کا بیش قیمت خادم ثابت ہوا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ استاد کے مکان پر درس میں وقت پر حاضر ہونے میں ہمیشہ مشہور رہا۔ طالب علم قرب و جوار کے گھرانوں میں رہتے سہتے اور معینہ اوقات پر قرأت کے واسطے جمع ہو جاتے تھے۔ ایک روز گھڑی نے ۷ بجائے۔ اور عادت کے موافق لوگ نماز کے لئے اُٹھے۔ استاد نے چاروں طرف نگاہ کی۔ اور مسٹر بروڈی کو غیر حاضر دیکھ کر تھوڑی دیر ٹھیر گیا۔ اب اسے کمرہ میں داخل ہوتے دیکھ کر یوں خطاب کیا۔ "جناب گھڑی گھنٹہ بجا چکی۔ اور ہم شروع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر چونکہ آپ غیر حاضر تھے۔ ہم نے خیال کیا کہ گھڑی تیز ہے۔ اور اس لئے ہم ٹھہرے رہے"۔ گھڑی حقیقۃً کچھ تیز تھی گو بعض اس میں بھی بہت سی کوتاہی کرتے ہیں۔ مگر قرضہ کی ایک رقم کثیر وقت پر ادا کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ صرف نہایت معمولی واقعات ایسے ہیں۔ جن میں ہمارے ناکام رہنے کا زیادہ احتمال رہتے۔ اس وقت مجھے بہت دیر ہو گئی۔ مگر آئندہ ایسا نہ ہوگا"۔ "آج میں اپنا کام وقت پر نہ کر سکا۔ مگر آئندہ ایسا نہ ہوگا"۔ لیت و لعل کے الفاظ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ ایک شخص کے وقت کا پابند نہ ہونے کی وجہ سے جسے صرف ۵ منٹ کی اور وہ بھی غیر ضروری طور پر دیر ہو گئی؟ خود مجھے بیسیوں میل گھوڑے پر سفر اور غیر ضروری صرف اور ہفتہ ہفتہ بھر سخت تحریری کام کرنا پڑا ہے۔ ہر بات میں وقت کی پابندی کرو۔ اگر تم فلاں وقت اُٹھنا چاہتے ہو تو وقت پر بستر پر پہنچ جاؤ۔ اگر ناشتہ سے پہلے تمہیں اتنا کام کرنا ہے تو اسے ضرور کرو۔ اگر تمہیں کسی ساتھی یا دوستوں کے حلقہ میں شامل ہونا ہے تو وہاں عین وقت پر پہنچو۔

صبح خیز ہو | بہت کم لوگ بڑی عمر کو پہنچے اور بہت ہی کم لوگ ممتاز ہوئے ہیں۔ جو صبح خیزی کے عادی نہ تھے۔ تم دیر سے اٹھتے ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کام دیر سے

شروع کرتے ہو۔ پس ہر کام دن بھر استر رہتا ہے۔ فرینکلن[1] کہتا ہے کہ "جو شخص دیر سے اُٹھتا ہے وہ دن بھر دوڑ دھوپ کرے تا ہم کام رات تک بھی نہ سمیٹے گا"۔ ڈین سوئفٹ[2] پورے وثوق سے کہتا ہے کہ "میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں جو صبح تک بستر پر پڑا رہ کر عظمت اور شہرت کو پہنچا ہو"۔

جس سے ملو اُس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کے عادی ہو۔

اس اصول کی پابندی یا اس کو نظر انداز کرنا ۴۰ برس کی عمر پر پہنچنے سے بہت پہلے تمہارے اخلاق میں ایک حیرتناک فرق پیدا کر دے گا۔ کم و بیش سب اس پر عمل کرتے ہیں مگر ایسے چند ہی ہیں۔ جو اس کو عادۃً یا دور اندیشی کے طور پر کرتے ہوں۔ اکثر اس کو کسی غرض یا فوری اشتیاق سے کرتے ہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اپنی زندگی میں ہم چیز کو اس لایق بنانا بہت دیر سے شروع کرتے ہیں کہ وہ ہماری علمی اطلاع کے ذخیرے میں اضافہ کرے۔ سر والٹر اسکاٹ[3] آگاہ کرتا ہے کہ "میں کسی پیشہ کے آدمی سے کبھی نہیں ملا جس سے چند لمحہ کی گفتگو میں کوئی بات نہ سیکھ لی ہو جس کو میں پہلے نہیں جانتا تھا اور میرے لئے مفید تھی"۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اُس کو ہر چیز کا خداداد علم حاصل تھا۔

جن اصول پر تم غور اور کام کرتے ہو انہیں مستحکم قرار دو

ایک اچھا طالب علم ہر لفظ کو حافظہ میں عمدہ طرح محفوظ کرنے کی یوں کوشش کرتا ہے کہ اگر وہی لفظ اس کے سامنے پھر آئے تو اس کو اپنی ڈکشنری کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے اُس کے ساتھ ہی اس لفظ کے مادہ اور جنس پر شاید جھگڑیں اور تلاش کے وقت یہ باتیں شاید وہ بھی نہ بتا سکا ہو۔ مگر اب اُس نے اس لفظ کی نسبت ایک مضبوط

---

[1] بنجمن فرینکلن امریکہ کا مشہور وطن دوست ہے ۱۷۰۶ء میں پیدا ہوا نہایت افلاس کی حالت سے ترقی کر کے اضلاع متحدہ امریکہ کی پریسیڈنسی تک پہنچا۔ ۱۲۹۷

[2] ایک آئرش پادری اور انگریزی زبان کا مشہور مصنف المتوفی ۱۷۴۵ء۔ ۱۲۹۷

[3] ولادت ۱۷۷۱ء وفات ۱۸۳۲ء مشہور انگریزی شاعر مصنف اور ناولسٹ ہے اور اسے تاریخی ناول کا موجد خیال کیا جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ اسکو سخت عداوت تھی۔ ۱۲۹۷

رائے قایم کر لی ہے۔ اور اسے کسی طرح کا شبہ نہیں۔ حالانکہ ممکن ہے کہ وہ تم کو یہ نہ بتا سکے کہ وہ اس رائے پر کس طریقہ سے پہنچا۔ ہر چیز کی یہی حالت ہونی چاہئے کسی مضمون کو اُس کی نسبت ایک سرسری خیال قایم کرنے کے لئے نہ جانچو۔ بلکہ اس وقت اگر تم کو جلدی ہو تو ٹھیرے رہو۔ حتی کہ تم اس کو اچھی طرح کرو اور ہمیشہ کے لئے اس سے فارغ ہو جاؤ۔ چنانچہ جب وہ مضمون پھر تمہارے سامنے آئے گا۔ تو تمہارا دل مطمئن ہوگا تمہاری رائے مستحکم ہوگی۔ یہ صرف مقبول اور مضبوط اصول کا ہونا ہے جو انسان کو مستقل مزاج بناتا ہے۔ یہی اصول صحیح اور غلط اور حقیقتہً ہر اس چیز کے متعلق ہیں جس کی نسبت قوت فیصلہ کو احتمالات کا مقابلہ کرنا ہو۔ کسی نتیجہ پر پہنچنے میں جلدی نہ کرو۔ نوجوان بہ نسبت قوت فیصلہ کی کمی کے عجلت کے سبب زیادہ غلطی کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ صرف اپنے آپ کو معاملہ کے تولنے کی مہلت دیں۔ تو ان کے نتائج عموماً صحیح ہوں ؎

اپنے ذاتی عادات میں سادہ اور صاف ہو

اکثر کہا جاتا ہے کہ آدمیوں میں کسی قدر غرور ہونا ضروری ہے ورنہ ان کی وضع قطع میں سلیقہ نہ ہوگا۔ اگر اس ریمارک کے کچھ بھی معنی ہیں۔ تو میں خیال کرتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ غرور سے ہماری ذاتی نمود میں اکثر اور بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ایک فرشتہ یا اور کوئی معصوم روح شکل صورت اور لباس میں بلا شبہ ممکن ہے کہ بھلا مانس ہو۔ مگر یہ غرور کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ مفید اور زیادہ شادمان ہونے کی خواہش سے ہوگا۔ تمہیں لوگوں کی نظروں سے گرانے کے لئے پھوہڑ عادتوں کی برابر کوئی اور چیز یقینی اور بلا کم و کاست نہیں ؎

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جانسن[1] مسودہ کو بغیر دوبارہ دیکھے مطبع میں بھیج دیا کرتا تھا۔ یہ عادت ہی کا اثر تھا وہ آہستہ مگر بڑی درستی اور موزونیت سے لکھا کرتا تھا۔ ہم قدرتی طور پر آہستگی کو روا نہیں رکھتے اور اتنا تھوڑا صبر ہمارے اختیار میں ہے کہ ایسے نوجوان کمیاب ہیں جو کسی کام کو حتی الوسع خوبی اور خوش اسلوبی

---

[1] شمعون جانسن ایل۔ایل۔ڈی ولادت ۱۷۰۹ء وفات ۱۷۸۴ء مشہور انگریزی مصنف۔ شاعر اور لغت نویس ہے۔ ۱۲۹۷

سے کرتے ہوں وہ اس کو جلد کرنا چاہتے ہیں اور طالب علموں کی باہمی بات چیت میں تم اکثر کسی کو کہتے سنتے ہو گے کہ فلاں شخص نے فلاں کام کیا اچھا اور کتنا جلد کیا۔ یہ ایک مضر عادت ہے اور جو کام کرنے کے قابل ہے۔ وہ اس لایق ہے کہ اچھی طرح کیا جائے اور ایک دل جو دوسرے لحاظ سے اعلے درجہ کا شائستہ ہے بالکل ناقص ہے اگر اس میں یہ عادت نہیں۔ ایک بڑے شخص کی کوشش اور کامیابی پر متعجب ہو کر کسی نے اس سے پوچھا کہ "آپ اتنا کام کیونکر کر لیتے ہیں"؟ "میں ایک وقت میں صرف ایک کام کو ہاتھ میں لیتا اور اسے ہمیشہ کے لئے تمام کر دینے کی کوشش کرتا ہوں"؛ لہذا میں یہ بات تمہارے دل نشین کراؤنگا کہ کوئی کٹا پھٹا خط گھر بھیج کر گھر والوں سے اس امر کی معافی مت چاہو کہ مجھے فرصت نہ تھی۔ ایسی جلد بازی کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ یہ خود اپنے حق میں ناانصافی کرنا ہے۔ کوئی یادداشت ایسی لاپروائی سے نہ لکھو کہ پانچ سال بعد وہ بالکل بے کار ہو جائے کسی کام کو اتنا جلد نہ کرو کہ جو کچھ کر رہے ہو۔ خود تمہیں اس کی خبر اور یقینی اطلاع نہ ہو اور پھر مبہم خیالات پر اعتماد کرنا پڑے۔ جس کو ہم اوچھا پن کہتے ہیں۔ اس کی یہی اصل ہے اور جو لوگ ہر کام کو اچھی طرح کرنے کے عادی نہیں ہیں ان کو سوا چھچھورپن کے کسی اور چیز کی امید نہیں کرنی چاہئے۔

اپنی طبیعت پر قابو رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہو

تصنیف اور مطالعہ کی نسبت سلیمانؑ کا مشہور قول بہت سی کتابیں تصنیف کرنے کا کوئی انجام ہی نہیں اور مطالعہ کی کثرت جسم کو گھولا دیتی ہے، زندگی پر بھی صادق آتا ہے۔ اور جو مطالعہ گوشت کو گھولا دیتا ہے۔ وہ تقریباً یقیناً اعصاب تک پہنچے گا۔ اور تم کو کم و بیش خلجان میں ڈال دینے کے لئے مستعد کر دے گا۔ کون خیال کر سکتا ہے کہ سحر نگار گولڈ اسمتھ[۱] اپنے گوشہ تنہائی میں اتنا بدمزاج اور ترش رو ہوگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ امر واقعی یہی تھا۔ اور شاید جو شخص سٹیزن آف دی ورلڈ، ڈیزرٹڈ ولیج اور وکار آف ویکفیلڈ لکھ سکا

---

[۱] الیور گولڈ اسمتھ ۱۸ ویں صدی عیسوی کا مستند انگریزی شاعر اور ناولسٹ ہے جانسن کا ہمعصر تھا ولادت ۱۷۲۸ء وفات ۱۷۷۴ء ۱۲۹

اس نے اپنی تصنیفات میں رحم دل اور نیک بننے کے لئے اپنی ساری قوت صرف کی ہوگی۔ چنانچہ جب گولڈ اسمتھ نے حیات اصلی کی طرف مراجعت کی ہے تو لطف زندگی حاصل کرنے کا کوئی سامان اس کے پاس موجود نہ تھا۔ کچھ ہو ہمیشہ یہی نہیں ہوتا کہ جو شخص اپنے قلم کے ذریعہ مہربان اور خوش خلق معلوم ہو وہ اس حیثیت سے خارج ہوکر بھی اپنے برتاؤ میں ترش رو اور کج خلق نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کبھی تو وہ نہایت خوش مزاج اور کبھی سب سے زیادہ بدمزاج ہے۔ اپنی ذات پر قابو پانے کے لئے تمہاری طرف سے کچھ کم کوشش درکار نہ ہوگی اصلی ہیاو۔ وہی ہے جو خود اپنی طبیعت پر قادر ہے۔ آزاد ہوکر کوئی اور عادت اتنی سرعت سے نہیں بڑھتی جتنا کہ کسی درست۔ سے جلد جلد باتیں کرنا۔ تھوڑی مدت میں وہ ایسی راسخ ہو جاتی ہے کہ پھر عمر بھر قایم رہتی ہے۔ اس عادت کے ترک کرنے کے لئے اخلاقی جرأت پیدا کرو۔ صاف دل اور فراخ حوصلہ بنو۔ یہ نہیں کہ آپ کو صرف ایسا ظاہر ہی کرو۔ بلکہ حقیقتہً ایسے ہو بھی۔ بعض لوگوں کے اطوار میں ایک قسم کی حوصلہ مندی اور شرافت روحی ہوتی ہے۔ جو بہت جلد ظاہر ہو جاتی ہے اور پھر اس کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فطرۃً سب انسان یکساں نہیں ہوتے بعض گمنام کم سخن اور دشمن نوع انسان پیدا ہوتے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کیوں اس طبعی خصلت کے تابع رہ کر اسے ترقی دیں۔ ممکن ہے اس کے متعلق بچپن میں تمہاری جانب سے غفلت کی گئی ہو مگر کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم بھی اپنی طرف سے غفلت کرو۔ اکثر تم ایسے طالب علم پاؤ گے جو باوجود قلیل البضاعتہ ہونے کے اپنی شرافت اور انسانیت کی وجہ سے بہت کچھ عزیز ہیں۔ میں یہ صرف اس لئے کہتا ہوں کہ تم بھول نہ جاؤ۔ کہ جو چیز اس خصلت کو تمہارے اخلاق میں پیدا کرتی ہے وہ غربت یا امارت نہیں ؛

صائب الرائے بنو | بعض لوگ تقریباً ایک فوری نظر سے ہر شخص کے اخلاق کی نسبت (جیس سے وہ ملتے ہیں) رائے قایم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کتاب کی نسبت۔ وہ اس کو لوٹتے ہیں۔ چند سطریں ایک جگہ پڑھیں۔ ایک دو جملے دوسری جگہ پڑھے اور بے تامل اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کر دیا۔ کسی شخص یا تصنیف کی نسبت جب ایک بار

تمہارے دل میں بدگمانی پیدا ہو جائے تو اس کو دور کرنا مشکل ہے۔ وہ بدگمانی
قوت فیصلہ پر حاوی ہو کر تمہیں ایک جانب مائل کر دیتی ہے اگر یہ عادت قایم رکھی
جائے تو دل بہت جلد بہ نسبت قوت فیصلہ کے بدگمانی پر عمل کرنے کا عادی ہو جاتا
ہے انصاف پسند اور صحیح دل ایک کم یاب اور بے بہا نعمت ہے لیکن اس قسم
کے دل کا تمام کاموں میں بے لوث ہونا اور بھی زیادہ غیر معمولی بات ہے۔ خدائے تعالےٰ
نے دل کی یہ صحت چند ہی لوگوں کو عنایت کی ہے۔ اور ان چند میں سے بھی اس
لوث سے بہت کم بچتے ہیں اور بالکل مبّرا تو کوئی نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایک
بار دیکھنے میں آئی۔ ایک گھڑی ساز نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک جنٹلمین نے
میرے ہاتھ میں ایک نفیس گھڑی دی جو لنگڑی چلتی تھی۔ گھڑی اپنی ساخت
میں نہایت اعلےٰ درجہ کی تھی۔ میں نے گھڑی کو کھول کر بیس بار ہی تو درست کیا
ہو گا۔ لیکن کوئی نقص دریافت نہ ہوا اور گھڑی کی چال بدستور رہی آخر مجھے
خیال ہوا کہ بیلنس ویل کسی مقناطیس کے قریب ہو گیا ہے۔ اس پر سوئی رکھی۔ تو
میں نے اپنے شبہ کو صحیح پایا۔ یہی سارا قصور تھا۔ اس کی چال پر گھڑی کے دوسرے
حصوں کے فولادی پرزوں کا اثر تھا۔ اس کے بعد گھڑی اتنی اچھی چال دینے لگی
جتنی ایک نئی گھڑی سے ممکن ہے۔ اس طرح اگر صحیح سے صحیح دل پر بھی کوئی
مقناطیسی اثر ہو جائے۔ تو اس کا بے قاعدہ کام کرنا ضروری ہے ؎

ماں باپ دوستوں اور ساتھیوں سے برتاؤ

میں امید کرتا ہوں کہ میرا تمہیں یہ ترغیب دینا بے موقع نہیں
ہے کہ دوستوں کے ساتھ مناسب سلوک کو عادت قرار دے
لو۔ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو تم ضرور اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ یاد رکھو کہ جب تم گھر
سے باہر ہو تو (بہ نسبت تمہارے والدین کے) تمہاری نسبت یہ زیادہ احتمال ہے
کہ تم اپنے والدین کو بھول جاؤ۔ تم نئے منظر دیکھتے اور سنتے واقف کار پیدا کرتے
ہو۔ تمہارے والدین گھر ہوتے ہیں۔ وہ تمہارے کمرہ اور تمہاری چیزوں کو دیکھتے ہیں وہ
اُن کمروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ جہاں تمہاری آواز اکثر اور مدت تک سنی گئی
تھی۔ ان کا دل تمہارے ساتھ ہوتا ہے وہ تمہیں کھانے کے وقت نہیں بلاتے
اور تمہارا ذکر کرتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا۔ کہ وہ تمہارا ذکر نہ کرتے ہوں

رات کو تمہارا تصور ان کے دماغ میں ہوتا ہے۔ ان کو تمہاری نسبت ہزاروں فکریں ہوتی ہیں۔ جن کو سوائے تمہاری توجہ کے کوئی چیز دور یا کم نہیں کرسکتی :

(ریاض الاخبار مورخہ ۸ و ۱۲ و ۱۶ جون ۱۹۰۳ء)

۴
نمک

ہرچہ درکان نمک رفت نمک شد (مثل)

نمک کم وبیش تقریباً ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف مٹی اور پانی میں مختلف نسبتوں سے ملا ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر حیوانات کے جسم میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک شخص جس کا وزن ۱/۲ اسو پونڈ (پونڈ = تقریباً آدھ سیر) ہو اُس میں کم سے کم ایک پونڈ نمک ہوگا۔ نمک ان جانوروں کے جسم میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ جن کا گوشت بطور غذا کے استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ اور افریقہ میں بہت ہی کم پیدا ہوتا ہے۔ یورپ اور ایشیا میں اس کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے۔ علی الخصوص ایران میں تو اس کی بڑی افراط ہے۔ ہندوستان کے اندر بھی بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے لیکن پھر بھی چشائر (انگلستان) سے درآمد کرنا پڑتا ہے درحقیقت یہ دنیا ہی ایک بہت بڑا نمک دان ہے۔

عہد ماضی میں بعض ممالک کی تجارت کا انحصار صرف نمک پر تھا۔ صحرائے افریقہ کی تجارت کی اب بھی یہی حالت ہے۔ نمک کے چار مصرف ہیں۔ (۱) خود ہماری غذا (۲) مویشیوں کی خوراک (۳) گوشت محفوظ رکھنے کے لئے (۴) زمین کی کھاد۔ بغیر نمک کے انسان کا جسم قوی نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر وہ بالکل نمک نہ کھائے۔ تو اس کا گوشت گل پڑتا ہے۔ بال جھڑ جاتے ہیں۔ آنکھیں دھندلی اور ہڈیاں ملایم ہوجاتی ہیں۔ اور اس کا سارا جسمانی نظام لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ نمک حیوانات کے گوشت میں بھی شامل اور ضروریات زندگی سے ہے۔ اور یہ خوش نصیبی ہے کہ دنیا اسے اس کثرت سے پیدا کرتی ہے

قیاس ہے کہ ابتدا میں انسان نمک کا استعمال بالکل نہ کرتا ہوگا۔ بعض قدیم قوموں کی نسبت تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ مذکور ہے کہ وہ نمک کے استعمال سے واقف نہ تھیں۔ اور بعض قومیں بہت قریب زمانہ تک نمک کے استعمال سے ناواقف تھیں۔ چنانچہ ہندوستان کی وحشی قوم ٹوڈا میں انگریزوں کے زمانہ سے نمک مروج ہوا ہے۔ وسط افریقہ میں نمک سامان تعیش میں شمار ہوتا ہے۔ اور صرف امراہی کام میں لاسکتے ہیں۔ یہی حالت حضر موت کے بدویوں کی ہے۔ اس کے متعلق ایک مذہب بھی ہے کہ نمک کا استعمال طریقۂ زراعت کے جاری ہونے کے زمانہ سے شروع ہوا ہے جو لوگ نمک سازی کا کام کرتے ہیں۔ ان کی صحت بہت اچھی رہتی ہے۔ زکام ریاحی درد اور وجع مفاصل کی انھیں کبھی شکایت نہیں ہوتی۔ البتہ بعض آدمیوں کی آنکھیں دُکھنے لگتی ہیں۔ قدرتاً جیسا کہ بیان ہو چکا مویشیوں کے گوشت میں کچھ مقدار نمک کی ہوتی ہے۔ تاہم نمک کے خزینہ کو تازہ ہونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جنگل کے وحشی حیوانات کینٹی کے اہلی مویشی اور فی الحقیقت تمام وہ حیوانات جو گھاس کھاتے ہیں۔ نمک کے نہ صرف خواہشمند ہیں۔ بلکہ بغیر اس کے تندرست نہیں رہ سکتے۔ بھیڑ کو چارہ کے ساتھ خاص طور پر نمک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ملکوں میں جہاں نمک کے چشمے ہوتے ہیں۔ مویشی نمکین پانی پینے کے لئے بہت دور دور جاتے ہیں۔

یہ خوب معلوم ہے کہ اگر گوشت میں نمک یا شورہ نہ لگایا جائے۔ تو وہ بہت جلد سڑ جاتا ہے لیکن اگر اس میں نمک ڈالدیا جائے۔ تو وہ اسے محفوظ رکھتا ہے۔ اب سے کچھ سال پہلے جہازوں پر گوشت کو برف میں دبا کر محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مگر اب جہاز پر علاوہ سینکڑوں ہر قسم کی اور آسائشوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں زندہ بھیڑیں رکھی جاتی ہیں اور مسافروں کو روزمرہ تازہ گوشت دیا جاتا ہے (جاننا چاہئے کہ برف کی ایک خاصیت یہ بھی ہے۔ کہ ہر چیز کو سڑنے گلنے سے بچاتا ہے۔ ملک سائبیریا میں ایک بار ایک مردہ ہاتھی برف کے اندر سے ڈیڑھ سو برس کے بعد بجنسہٖ نکلا تھا)

بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں جو نمک پڑنے سے اور زیادہ زرخیز ہو جاتی ہیں اور بعض سبزیاں جو غذا کے لئے مفید ہیں شور زمین میں اچھی بڑھتی ہیں مثلاً ناریل کے درخت بحری ساحل کے قریب خوب پھولتے پھلتے ہیں۔ جہاں زمین میں کثرت سے

نمک ملا ہوتا ہے۔ مگر یہاں ہندوستان میں نمک کے کھاد کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ شور کھیتوں یا دوسروں میں گھاس یا غلہ کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔

نمک کی نسبت یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ زمانہ قدیم حبش، تبت اور اس کے ملحقہ علاقوں میں اس کی ٹکیاں بطور سکہ کے جاری تھیں۔ اور ریاستہائے شان میں سنا ہے اب بھی ایسا ہوتا ہے۔

جدید اصول علاج میں نمک ہیضہ کے مریضوں کے خون میں داخل کرنا خاص طور پر مفید ثابت ہوا ہے۔

بطور رزق کے نمک کی جس قدر حرمت کی جاتی تھی وہ بعض رسموں سے ظاہر ہے مثلاً بعض ملکوں میں (منجملہ ان کے فلسطین میں) یہودیوں کے ہاں مہمان دستر خوان پر نمکدان کی ترتیب سے بٹھائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ نمک کے قریب اور کم رتبہ کے اس سے دور بٹھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے جاہل باشندوں میں عہد و پیمان نمک کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔ فریقین کے بیچ میں نمک کی ایک کٹھوٹی رکھ دی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے ہاتھ میں نمک کی ایک ایک کنکری لے لیتا ہے۔ اور یہ انھیں دایمی وفاداری پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا ایک اور بھی قاعدہ ہے کسی برتن میں نمک گھول کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنی انگلی اس میں ڈال کر چکھتا ہے اور پھر یہ جماعت ایسی متحد ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی فرد نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلنے کے خوف سے عہد شکنی کی تاب نہیں لاتا۔ پرانے آدمی نمک کو اس ڈر سے کہ کہیں قیامت کے دن پلکوں سے نہ اٹھانا پڑے زمین پر کبھی نہیں گرنے دیتے۔ جرمنی والوں کا خیال ہے کہ جس جگہ نمک ہو وہاں دعا جلد مقبول ہوتی ہے۔ یونانی، رومی اور سامی نذر و نیاز کے ساتھ نمک کا ہونا لازمی جانتے تھے۔ یونان کے مشہور شاعر ہومر[۱] نے ایک جگہ نمک کو "مقدس" لکھا ہے۔ عرب بھی نمک کے ذریعہ سے عہد و مواثیق کرتے اور کہتے ہیں الملح بیننا یعنی ہمارے تمہارے درمیان نمک ہے۔

---

[۱] سنہ ۹۵۰ ق م اور سنہ ۸۵۰ ق م کے مابین تھا گو بعض مورخین کو سرے سے اس کے وجود ہی میں شک ہے کم از کم یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے کہ وہ اندھا تھا۔ ۱۳۹

ایران اور ہندوستان میں وفادار خادم کے لئے "نمک حلال" اور بیوفا کے لئے "نمک حرام" کا لفظ ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ چونکہ نمک چیزوں کو خراب ہونے سے محفوظ رکھتا ہے اس لئے اگر خادم (جس نے آقا کے گھر کا نمک کھایا ہوتا ہے، خرابی لائے تو گویا اس نے کھائے ہوئے نمک کو حرام یعنی ضایع کر دیا اور بصورت عکس بالعکس۔ اب ہمیں اپنے دل میں سوال کرنا چاہئے۔ کہ وہ مختلف ذرایع کیا ہیں جن سے نمک فائدہ کے ساتھ لیا یا تیار کیا جا سکتا ہے؟ ابتدائی زمانہ میں نمک حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک خاص قسم کی لکڑی پر کھاری پانی ڈال کر اس لکڑی کو جلاتے تھے اور اس کی راکھ کو بطور نمک کے کام میں لاتے تھے آج کل پانی سے نمک بذریعہ عمل تبخیر نکال لیتے ہیں۔ اس طریقہ سے سب سے زیادہ نمک اسپین میں بنتا ہے۔ جہاں اس کی سالانہ مقدار ۲½ لاکھ ٹن (ٹن = ۲۸ من) ہوتی ہے۔ ساحل سمندر کے قریب بہت بڑے قطعہ زمین پر کیاریاں بنا دیتے ہیں۔ جب سمندر کو مد ہوتا ہے۔ تو پانی نکل کر ان کیاریوں میں بھر جاتا ہے۔ کیاریوں کی سطح کو پختہ کر دیتے ہیں۔ تاکہ پانی زمین کے اندر جذب نہ ہونے پائے۔ تمازت آفتاب سے پانی رفتہ رفتہ اڑ کر نمک نیچے رہ جاتا ہے۔ جن سمندروں میں جوار بھاٹا نہیں آتا۔ وہاں مصنوعی ذرایع سے پانی کیاریوں میں لایا جاتا ہے

نمک حاصل کرنے کے ذرایع دو بڑی سرخیوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں یعنی خشکی اور تری (۱) خشکی کے ذیل میں جو ذرایع ہیں وہ یہ ہیں۔ پہاڑ۔ کانیں اور کھیت (۲) تری کے ذیل میں یہ ہیں۔ جھیلیں۔ چشمے اور سمندر

نمک کے پہاڑ ہندوستان میں پنجاب کے بعض شمال مغربی اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ ہندوستان کے بڑے نقشہ کو دیکھیں تو معلوم کرینگے۔ کہ "کوہستان نمک" کا نام اس پہاڑی سلسلہ کو دیا گیا ہے۔ جو دریائے سندھ اور جہلم کے بیچ میں مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں نمک بڑے بڑے تودوں کی صورت میں کاٹا جاتا ہے۔ جو بلحاظ مقدار اور صفائی کے دیگر ملکوں کے نمک سے کم نہیں ہوتے۔ تقریباً پچاس ہزار ٹن (۱۴ لاکھ من) نمک ان پہاڑوں سے سالانہ پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب کا یہ "سلسلہ کوہستان نمک" دنیا میں سب سے قدیم ہے۔ یہاں ایک مقام "لون میانی" کے نام سے مشہور ہے جس کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ اس جگہ "لون" یعنی نمک بہت پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب کے نمک کی منڈی غالباً کسی زمانہ میں لاہور ہوگا! اسی لئے یہ نمک "لاہوری نمک" کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔

آتش فشاں وہ جلتا ہوا پہاڑ ہے جو پگھلی ہوئی چٹانیں وغیرہ اپنی چوٹی سے پھینکتا رہتا ہے۔ خروج کے بعد پہاڑ کے پہلوؤں پر شگاف اور درزیں (اور خصوصاً وہ جو اس کے منہ کے قریب ہوں) اکثر نمک کی موٹی تہ سے ڈھک جاتی ہیں۔ شاید اس نمک کو زمین کے نیچے کسی بہت بڑے کھولتے برتن میں قدرت بالکل اسی طرح بناتی رہتی ہے جیسے "لُونیے" اپنے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں زمین کے اوپر بناتے ہیں (ہندوستان میں کوئی آتش فشاں پہاڑ نہیں ہے۔)

آپ جانتے ہیں کہ کان ایک گڑھا ہوتا ہے۔ جو زمین میں کھودا اور بعض اوقات بہت گہرا کھودا جاتا ہے۔ ہندوستان میں نمک کی کوئی کان نہیں ہے یورپ میں البتہ کثرت سے ہیں۔ ملک پولینڈ میں ایک مشہور کان ہے جو زمین کے اندر ہی اندر ایک میل سے زیادہ تک چلی گئی ہے جس میں سڑکیں اور مکانات سارے خالص نمک کے کاٹے گئے ہیں۔ جب یہ کان (تو بہ توبہ شہر) خوب روشن کیا جاتا ہے تو نمک کی سفید دیواروں سے لگی ہوئی شمعیں بڑی آب و تاب کے ساتھ خاصی ایک نمائش ہوتی ہیں۔

نمک کے چند کھیت پنجاب میں اس سے زیادہ صوبجات متحدہ اور سب سے زیادہ شمالی بہار میں ہیں۔ ان کو "اوسر" کہتے ہیں بعض کھیتوں پہ ایک سفید سفوف (خصوصاً زور کی بارش کے بعد) نظر آتا ہے۔ جس مٹی میں یہ سفوف ہوتا ہے وہ کھرچ کر ایک بڑے برتن میں رکھی جاتی ہے۔ جس میں سے پانی ٹپک ٹپک کر باہر نکل جاتا ہے۔ جو پانی باہر ٹپک آتا ہے وہ برتنوں میں جوش کر لیا جاتا ہے۔ اور نمک (مع اس کے قریب قریب ایک اور چیز یعنی شورہ کے) بن جاتا ہے۔ شمالی ہند میں ایک قوم ہے۔ جو "لونیا" یا "نونیا" کہلاتی ہے۔ یہ لوگ بالتخصیص اس قسم کی مٹی سے نمک نکالنے کا پیشہ کرتے ہیں

اب ہمیں اُن ذرایع کو جانچنا چاہیئے جو تری کے ذیل میں ہیں یعنی جھیلیں چشمے اور سمندر۔ جس طریقہ سے ان مخرجوں میں سے کسی سے بھی نمک نکلتا ہے اسے "تبخیر" کہتے ہیں لیکن وہ طریقہ کیا ہے؟ سمندر میں سے کسی برتن میں پانی لے کر دھوپ میں رکھ دو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب خشک ہو جاتا ہے۔ اور بالکل باقی نہیں رہتا۔ یہی تبخیر ہے آفتاب کی گرمی سے پانی بھاپ یا ذرات مائیہ میں منتقل ہو جاتا ہے اور یہ ذرے اتنے خفیف اور لطیف ہوتے ہیں کہ دیکھے یا محسوس نہیں کئے جاسکتے۔

درحقیقت پانی ہوا میں جذب ہوکر اس کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ مگر فرض کرو پانی میں مٹی یا اور کوئی کثیف مادہ (مثلاً نمک) ملا ہوا ہے۔ اس وقت کیا ہوگا۔ پانی اڑکر نمک برتن کے تہ میں رہ جائیگا۔ تو پانی سے نمک نکالنے کا یہی طریقہ ہے نمکین پانی اتھلی کڑھائیوں میں بھرکر اُن کو یہاں تک گرمی پہنچائی جاتی ہے کہ پانی خشک ہوکر سوا شور تلچھٹ کے اور کچھ باقی نہیں رہتا ؛

ایشیا اور یورپ کے بیچ میں ایک بہت بڑی نمک کی جھیل ہے۔ جسے بحرِ اخضر کہتے ہیں۔ یہ سمندر کیا جھیل ہی ہے کیونکہ چاروں طرف خشکی سے بالکل گھری ہوئی ہے مگر اپنے جرم کی وجہ سے سمندر ہی کہلاتی ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اس کا پانی میٹھا نہیں ؛

ہندوستان میں نمک کی جھیلوں کی سب سے بہتر شال راجپوتانہ میں سامر جھیل ہے نقشہ میں آپ اُس کا نشان کوہ اراولی کے دامن میں اجمیر سے کسی قدر شمال کی جانب پائیں گے ؛

ہندوستان میں نمک کا کوئی قدرتی چشمہ نہیں ہے۔ انگلستان میں بہت سے ہیں۔ بنگال کے جنوبی حصوں میں کنوؤں کا پانی اکثر کسی قدر کھاری ہوتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کے نیچے پانی کے سوت شور سطح سے ملے ہوئے ہیں۔ مگر ان کنوؤں میں نمک کی مقدار صرف اس قدر ہے کہ پانی بدمزہ ہو جائے۔ اتنی کافی نہیں کہ اس کے نکالنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑے۔ چین کے صوبہ سیچوئن میں چند چشمے ایسے ہیں کہ ان کے پانی سے بذریعہ تبخیر نمک بنتا ہے۔ اس عمل کے لئے جو ایندھن درکار ہوتا ہے۔ اس کا کام خود پانی ہی سے لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس پانی میں ایک ایسی آتشگیر گیس شامل ہوتی ہے جس سے وہ بآسانی جل سکتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جہاں مٹی کا تیل ہوتا ہے۔ وہاں قرب وجوار میں نمک کی کان بھی ضرور ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس تیل اور نمک میں گہرا تعلق ہے۔ چین میں نمک کے کنوئے بھی ہیں۔

سمندر دنیا بھر میں نمک کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ کیونکہ سطح زمین کا بڑا حصہ سمندر سے ڈھکا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ سمندر کے پانی میں ہر جگہ کثرت سے نمک ملا

ہوتا ہے ہندوستان میں نمک تبخیر کے ذریعہ سے ساحل کے ایک سرے سے دوسرے تک بنایا جاتا ہے۔ مگر اس صنعت کے خاص خاص مرکز گجرات اور ساحل کارومنڈل ہیں سمندر کے پانی میں فی گیلن (گیلن = ۱۴ اسیر) ۲۵۴۷ء۲ پونڈ نمک شامل ہے۔ بالفاظ دیگر اگر تمام سمندروں کے پانی کو کسی ذریعہ سے اڑا دیا جائے تو اتنا نمک رہ جائیگا۔ کہ اس کا ڈھیر (۴۴۱۹۳۰۶۰) مکعب میل ہوگا۔ سمندروں میں سب سے زیادہ نمکین "بحیرۂ مردار" ہے اسی وجہ سے اس کو "بحیرۂ شور" بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ میٹھے پانی کا اس میں صرف ایک چھوٹا سا دریا ملتا ہے۔ اور اس کا پانی باہر نکلتا نہیں اور بذریعہ تبخیر کثرت سے اُڑتا رہتا ہے اس لئے اس کی شوریت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں خلیج کچھ بھی زیادہ شور ہوتی جاتی ہے۔

نمک پر محصول سب سے پہلے سنہ ۱۷۰۲ء میں قایم ہوا تھا لیکن چونکہ یہ ایسی چیز ہے۔ کہ اس کے استعمال سے کوئی فرد بشر مستغنی نہیں ہے اس لئے بہت سے ممالک میں اس پر سے محصول اٹھا دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں نمک کے محصول کی موقوفی کا خیال سب سے پہلے لارڈ رپن وائسرائے و گورنر جنرل ہند (از سنہ ۱۸۸۰ء تا سنہ ۱۸۸۴ء) کو ہوا۔ مگر لارڈ کرزن سابق وائسرائے نے دربار دہلی سنہ ۱۹۰۳ء کے موقع پر صرف تخفیف محصول کا اعلان کیا۔ اس کے بعد محصول نمک میں مزید تخفیف ہوئی ہے جس سے ہندوستان میں اس کا نرخ ۲۴ سیر فی روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ (ریاض الاخبار۔ ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۰۳ء)

۵
ہندوستان کی آئندہ سوشل حالت

(علی گڈھ منتھلی سے ترجمہ)

یہ مضمون کسی قدر وسیع اور اس پر اچھی طرح بحث کرنے کے لئے اس جیسے پرچے کی بجائے کوئی چھوٹی موٹی کتاب زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے میں نے صرف ان چند ہی باتوں پر اکتفا کیا ہے۔ جنکا سوسائٹی پر براہ راست اثر ہے۔

دور دراز آئندہ زمانہ کے حالات کی نسبت پیشین گوئی کرنا کسی طرح آسان کام

نہیں ہے۔ اور پھر ان احتمالات اور شکوک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی پیشین گوئیوں کے لئے ہمیشہ ایک خاص حد تک ضروری ہیں جو مسئلہ اپنی نوعیت میں ایسا ہو کہ اس کی صاف تشریح اور تعریف ہی نہ ہو سکے۔ بھلا اس کی نسبت کسی علم ہندسہ کی رو سے صحیح جواب کی کب امید ہو سکتی ہے؟ اس لئے جو کچھ اس میں کہا جائے۔ اُسے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مسلّم الثبوت تحقیقی باتیں ہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ وہ قیاسی اور فرضی نتیجے ہیں جو موجودہ واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں ؛

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ بعض ہندوستانی وطن دوستوں کی سرگرم کوششوں سے خصوصاً اور ایک خاص حد تک برٹش گورنمنٹ کی مفید پالیسی سے اس زمانہ میں ہندوستان کی سوشیل حالت میں بہت سی ترقیاں ہو گئی ہیں۔ ستی کی وحشیانہ رسم کے خلاف قانون کی سخت سخت قیدوں نے ہندوستانی سوسائٹی کے اکثر حصہ کو ایک خوفناک اور ظالمانہ رواج سے آزاد کر دیا ہے اس لئے کہنا چاہیئے کہ گورنمنٹ کا یہ کام ملک کے حق میں بہت کچھ مفید پڑا ہے اور غلامی کا موقوف ہونا ایک اور عمدہ مثال ہو سکتا ہے "نئی روشنی" نے ہندوستان کی سوسائٹی میں عام طور پر بہت سی تبدیلیاں کی ہیں جو بیشک بہت مفید ہیں۔ فرض کا ادراک راستبازی اور ایمانداری جو ہم بہ نسبت گزشتہ نسل کے اس نئی نسل میں زیادہ پاتے ہیں۔ وہ انگریزی تعلیم ہی کا نتیجہ ہے ہندوستانی سوسائٹی پر انگریزی تعلیم اپنا جو اثر ڈال رہی ہے وہ قابل غور ہے۔ ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیاں روشن خیال اور تربیت یافتہ ہندوستانی طلبہ کی ایک کثیر تعداد نکالتی رہتی ہیں اور اس طرح ملک کی سوسائٹی میں سال بسال عمدہ اور مفید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے انگریزی تعلیم ہماری سوسائٹی کو براہ راست متاثر کرتی ہے لیکن ایک اور دوسرا میرے خیال میں زیادہ قوی اثر ہے جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم جو عام طور پر ملک کے مختلف حصوں سے آتے اور اپنی تعلیم کو پورا کر کے یا دوران تعلیم کے دوران میں بھی جب اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ تو ان خاص سوسائٹیوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں جن میں وہ رہتے ہیں اور اپنے غیر تعلیم یافتہ بھائیوں کے لئے نمونہ کا کام دیتے ہیں۔ خواہ یہ لوگ دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کے لئے کوئی خاص اور صریح طریقہ عمل میں نہ لائیں۔ تو بھی خود اُن کے افعال اُن کی عادات اُن کی وضع اُن کے

ہم جنس بھائیوں کے اخلاق پر آہستہ آہستہ مگر پورا اور یقینی اثر کرتی ہے۔ یہی سلسلہ کچھ مدت سے ملک میں جاری ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں انگریزی تعلیم نے سب سے پہلے جڑ پکڑی عام طور پر وہاں کے باشندوں کی سوشیل حالت اور مقامات کی نسبت بہتر حالت میں ہے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا اور اس کے جاری رہنے کا ہر ایک غالب گمان ہے، تو کسی کو یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ہماری سوسائٹی بہت زیادہ مہذب، بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوگی۔

ممکن ہے کہ کسی سوشیل مباحثہ میں ایسا معلوم ہو کہ تعلیمی معاملات کو نا واجبی امتیاز دیا جا رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ سوسائٹی پر تعلیم کا بہت بڑا اور نتیجہ خیز اثر ہے اور یہ کہ سوشیل ترقی تعلیمی ترقی کے ساتھ ملی جلی ہونی چاہیئے۔ کوئی سوسائٹی حقیقتاً عمدہ سوسائٹی نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ یا جب تک اُس کے اکثر افراد پر اعلیٰ تعلیم کا اثر نہ ہو۔ اس لئے اپنی سوسائٹی کو ترقی دینے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اُسے تعلیم دینا اور تمام دقیانوسی بیہودگیوں اور تمام جاہل اور ذلیل فرقوں کی عام خصوصیات کو اُس سے دور کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کی سوسائٹی اس مرض میں بے طرح مبتلا ہے۔ اور ہمارے بڑے بڑے روشن ضمیر ناصحوں نے سب سے اچھا جو علاج دریافت کیا ہے۔ وہ تعلیم ہے۔ میری رائے میں یہی اصول ہے جس پر مسلمانوں نے سوشیل اصلاح شروع کی ہے۔ اگر مسلمان اپنی جماعت کو تعلیم دینے میں کامیاب ہو گئے تو اُن کی سوشیل حالت میں ترقی ہو جانا اس کا یقینی نتیجہ ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھتے گو کوئی شخص عام طور پر ہندوستانی سوسائٹی کے حق میں پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ پھر بھی مسلمانوں کی نسبت خصوصاً یہ مسئلہ ذرا مشکوک ہے۔ تعلیم کی طرف سے اُن کی یہ بے پروائی کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے کھچاوٹ اور قومی جوش کا نہ ہونا ایک تاریک آئندہ زمانہ کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ اور اگر اپنے رقیب قوموں کا ساتھ نباہے بغیر وہ کچھ تھوڑی بہت ترقی بھی کریں۔ تاہم اُن کی کوشش کا کارگر نہ ہونا یقینی ہے۔

مذکورہ بالا سوال کے ساتھ ہی بلکہ اس کا ایک جزو تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے۔ سب سے بڑا اور افسوس کے قابل ہماری سوسائٹی میں جو نقص ہے وہ عورتوں میں تعلیم کا نہ

ہوتا ہے۔ ہندوستانی سوسائٹی کو اس کمی سے طرح طرح کے نقصانات پہنچے ہیں۔

ہماری سوسائٹی کی یہ پستی اور بد اطواری بہت کچھ اسی نقص کی وجہ سے ہے۔ مگر آج کل ہندوستانی کچھ کچھ اس طرف متوجہ ہو چلے ہیں۔ اس موقع پر ہم سرجان اسٹریچی کے چند جملے ضرور نقل کرینگے۔ جو اس مسئلہ کے متعلق ہیں۔ "یہ خیال کہ عورتوں یا کم سے کم معزز خاتونوں کو اسکول کی یا کوئی اعلیٰ قسم کی تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔ جو لڑکوں کے واسطے بھی موزوں ہو ایسا ہے۔ جسے ہندوستان میں کوئی جانتا بھی نہیں۔ یہاں تک کہ یہ خیال آبادی کے اس حصہ میں بھی اجنبی ہے۔ جہاں مغربی عادات اور خیالات نے نہایت قوی اثر ڈالا ہے۔ اس میں چند مستثنیات بھی ضرور ہیں لیکن نسبتہً شاذ و نادر قاعدہ سے وہ لوگ بھی جنہوں نے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ جو بڑے سے بڑے انگریزی اسکول اور کالج دے سکتے ہیں۔ اپنی بیبیوں اور بیٹیوں کی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے کسی قسم کی رغبت ظاہر نہیں کرتے ...... اور تو اور اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ لکھنا پڑھنا وہ کمال ہے جس سے باعصمت عورتوں کا دور ہی رہنا اچھا" گو اس فاضل مصنف سے کوئی بالکل متفق نہ ہو مگر جو جملے یہاں نقل کئے گئے ہیں معمولی طور پر ایسے ہیں۔ جن کی سچائی سے انکار کرنا مشکل ہے۔ مگر وہ "شاذ" مثالیں جن کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ اور ہر تعلیم یافتہ مقام پر تعلیم نسواں کی طرف میلان ترقی کرتا جاتا ہے۔ جس سے آئندہ بہت کچھ ترقی کی امید ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں نے آج کل اس امر پر بڑے زور شور سے غور کرنا شروع کیا ہے۔ اور امید ہے کہ عن قریب ہندوستان میں تعلیم نسواں خاطر خواہ حالت میں ہو جائیگی۔ یہ کہنا کچھ ضرور نہیں کہ اگر تعلیم نسواں کی نسبت ہماری تمنائیں بر آئیں۔ تو ہماری سوسائٹی میں بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ ہماری خانگی زندگی نہایت خوش گوار اور ہمارے بچوں کی ابتدائی تربیت (جس سے زندگی کے نہایت اثر پذیر حصہ میں اخلاق کے بننے پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے) کہیں بہتر حالت میں ہو گی۔

ایک اور نہایت اہم سوشل مسئلہ پردہ کی نسبت ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اسی مسئلہ پر حال میں ہز ہائی نس سر آغا خاں نے بمقام دہلی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں بحث کی تھی۔ یہاں انہوں نے صاف بتا دیا

ہے کہ پیغمبر صلعم اور ان کے قریبی خلفاؓ کے عہد میں جیسا ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے اس پردہ کا نام بھی نہ تھا۔ یہ کہ اس زمانہ میں اس قسم کا پردہ تھا جس کو ہمارے روحانی پیشواؤں نے پسند فرمایا تھا ایک امر واقعی ہے۔ خود قرآن شریف میں ایسے احکام ہیں جن کی رو سے عورتوں کے لئے ایک معتدل حجاب ضروری ہے۔ مگر اس سے اُس جبر قید کا جواز کسی طرح ثابت نہیں ہوتا جس میں ہندوستانی مسلمان عورتیں پڑی ہوئی ہیں۔ ہندوؤں میں پردہ کی اتنی پابندی نہیں ہے جتنی مسلمانوں میں ہے۔

جب ہم اس پر غور کریں کہ ہندوستان میں آئندہ پردہ کونسی شکل اختیار کرے گا تو دیکھنا چاہئے کہ باوجود انگلستان اور ہندوستان کے عرصہ دراز کے میل جول کے ہندوستان نے اس مسئلہ کی نسبت اپنے انداز کو مطلق نہیں بدلا۔ انگلستان کے اثر سے ہندوستانی سوسائٹی میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی ہیں مگر پردہ میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔ یہاں تک کہ خود پردہ کے مخالفوں نے جن کی تعداد میری رائے میں بہت کم ہے کوئی عملی مثال قائم نہیں کی۔ جو کچھ انہوں نے اوروں سے کرانا چاہا ہے۔ خود اس کے موافق عمل نہیں کیا۔ پردہ کا یک قلم موقوف ہوجانا ایسی بات ہے جس سے ہندوستانی دل بالکل بے خبر ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی حالت ہندوستان میں تقریباً ناممکن بھی ہے۔ یہ کبھی نہ سمجھنا چاہئے کہ ہندوستانی عورتیں پردہ سے بیزار ہیں۔ نہیں وہ ایک بار سے زیادہ پردہ کے اُٹھ جانے کے خیال پر اپنی ناراضی ظاہر کرچکی ہیں۔ پردہ کی نسبت ایک بحث میں بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا۔ جو دو سال کے قریب ہوئے ایک طرف ایک عیسائی مشنری لیڈی اور دوسری طرف مسلمان مستورات کے مابین اُس اخبار میں جاری تھی جس کی ایڈیٹر لاہور کی ایک مسلمان خاتون ہیں۔ اسی میں ایک مسلمان بی بی نے پردہ پر اخلاق اور عصمت کی حیثیت سے بحث کی تھی۔ اور جس سچے طریقہ سے پردہ کی حمایت میں اس نے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے یہ یقینی ہے کہ جو پردہ آج کل برتا جاتا ہے آئندہ اس کی اچھی طرح اصلاح ہوجانی چاہئے۔ میری رائے میں جو صورت پردہ کی ہونی چاہئے

ؔ افسوس ہے کہ آخر سنہ ۱۹۰۰ء میں ان کا انتقال ہوگیا - ۱۲۹۷

وہ اس سخت دستور اور بالکل بند نہ ہونے کے بین بین ہو یعنی قریب قریب جو ایران اور عرب میں جاری ہے۔ وہاں عورت برقع اوڑھ کر گھر سے باہر آ سکتی ہے۔ یہی دستور اس موجودہ رواج کے بجائے قایم ہونا چاہئے اور یہ بالکل دوسرا سوال ہے کہ اس "بین بین" کا قایم مقام کونسا طریق عمل ہوگا۔ لباس کا مسئلہ تو بالکل پرانا ہی ہو چکا اس لئے اس پر مختصر طور پر بحث کرنا ہی مناسب ہوگا۔ ہمارے انگریزی لباس اختیار کرنے کا میلان یورپین صاحبوں اور خود ہمارے اہل ملک کے طعن آمیز ریمارکوں کا اکثر نشانہ بنا ہے اپنی ایک اسپیچ میں لارڈ کرزن نے اس مضمون کا ریمارک کیا تھا۔ کہ "انگریز نما ہندوستانی ایسا ہی نا اہل منظر پیش کرتا ہے جیسا کہ ہندو نما انگریز" اس قول کی صحت کو ضرور تسلیم کرنا چاہئے ہندوستان ہم سے چاہتا ہے کہ ہم اس کی جائز خصوصیات کو قایم رکھیں۔ اور اپنے کو اس کے قابل بیٹے ثابت کریں۔ اس کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ کسی اچھی اور مفید رسم کو جو ہم میں نہ ہو صرف اس وجہ سے اختیار نہ کرنا چاہئے۔ کہ وہ اجنبی ہے۔ بلکہ جو میرا مقصد ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں ہندوستانی ہونے پر ناز ہونا چاہئے۔ نہ اوروں کے نقال بننے پر۔ اس مسئلہ پر کچھ عرصہ سے ہندوستان کے مختلف فرقے متوجہ ہو چلے ہیں۔ ہندو قومی فدائی مذکورۂ بالا میلان کے روکنے کی سرگرم کوششوں میں پیش قدمی کر رہے ہیں اور مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ ان کی کوششیں ضرور مشکور ہوں گی۔

مذہب اگرچہ اصل میں اس پرچے کے لایق مضمون نہیں۔ مگر چونکہ سوسائٹی کا جزو اعلےٰ ہے۔ اس لئے اپنی سوسائٹی کی مذہبی حالت کی نسبت چند ریمارک کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ کارلائل[1] کے الفاظ میں "انسان کا مذہب ہی اس کی اصلی خصوصیت ہے۔ مذہب سے یہاں اس کا کوئی خاص عقیدہ مراد نہیں جس کا وہ پابند ہے..... بلکہ وہ بات جو عملی طور پر اس کے دل میں ہوتی ہے اور وہ یقینی علم جو اسے اس پُر اسرار عالم کے ساتھ اپنے تعلقات کا ہوتا ہے" جب مذہب کی یہ تعریف ہے جس کو میں نے اختیار کیا ہے تو مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کے تعلیم یافتہ حصہ میں عام روحانی نقصان اور مذہبی زوال کی یقینی علامت دخل پاتی

---

[1] ٹامس کارلائل مشہور انگریزی فلاسفر ولادت ۱۷۹۵ء وفات ۱۸۸۱ء۔ ۱۳۹۷

جاتی ہے۔ اور کارلائل کا قول استعمال کریں۔ تو "زبانی عقیدہ" پیچھے اعتقاد کا قایم مقام ہو جاتا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا ہے اور ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کثرت سے مختلف العقاید فرقے ہیں۔ گورنمنٹ سے اس قسم کی تعلیم کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے ہمیں خود رعایا کی طرف نگاہ کرنی چاہئے۔ یہ ہر جماعت کا فرض ہے کہ اپنے لئے ایسی تعلیم گاہیں قایم کرے۔ جہاں دینی اور دنیوی کورس آپس میں شیر و شکر ہوں اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے۔ کہ ہندو مسلمان دونوں نے اس ضرورت کو پہچان کر اس مسئلے کے حل کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ اس کی عملی مثال کے طور پر اس صوبہ میں خود ہمارا علی گڑھ کالج اور نیا قایم کیا ہوا ہندو کالج بنارس بتائے جا سکتے ہیں۔ یہ میلان ہماری سوسائٹی کی آئندہ بہبودی کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ اور اگر مذکورہ بالا جیسی انسٹیٹیوشنوں کے خیالات پورے ہو گئے۔ تو آئندہ ہمیں ایسی سوسائٹی کی امید کرنے کا موقع ہے۔ جو مذہبی اور اخلاقی خصوصیات میں قابل نمود ہو گی۔ (ریاض الاخبار ۲۴-۲۸ و ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء و یکم جنوری سنہ ۱۹۰۴ء)

۶

دو شاہراہیں

(ایک جرمن مصنف جین[1] پال رکٹر[2] کے ملفوظات سے)

نئے سال کی رات تھی۔ ایک بوڑھا شخص کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی غمگین آنکھیں گہرے نیلے آسمان کی طرف اٹھائیں۔ جہاں ستارے ایک صاف ساکن جھیل کی سطح پر سفید بنفشہ کے پھولوں کی طرح تیر رہے تھے۔ پھر اس نے اپنی نظر زمین پر ڈالی۔ یہاں مرد اور عورتیں اپنی کسی منزل مقصود (یعنی قبر) کی طرف حرکت کر رہے تھے۔ جن میں خود اس کی طرح کوئی بھی مایوس اور بدبخت نہ تھا۔ وہ اُن منزلوں کا اکثر حصہ طے کر چکا تھا۔ جو زندگی کے سفر کے تمام پیش ہیں۔ اور اس سفر سے دو سوائے

---

[1] ولادت ۱۷۶۳ء وفات ۱۸۲۵ء [illegible]

گناہوں اور ندامتوں کے کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ اس کی صحت غارت ہو چکی تھی۔ اس کا دل غمگین۔ اور اُس کا یہ بڑھاپا تسلّی اور تسکین سے خالی تھا۔ اس کے شباب کے دن ایک خواب کی طرح اس کے سامنے آمے اور اُسے وہ سُہانا وقت یاد آیا۔ جب کہ اس کے باپ نے اسے دو سڑکوں کے سرے پر کھڑا کر دیا تھا۔ ایک تو پُرامن معتدل سرزمین کو جاتی تھی۔ جو شاداب اور ہری بھری فصلوں سے ڈھکی ہوئی اور ملایم شیریں راگوں سے گونج رہی تھی۔ دوسری بھٹکے ہوئے مسافر کو گہرے تاریک غار میں پہنچاتی تھی۔ جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ جہاں پانی کی جگہ زہر بہتا تھا اور جہاں سانپ رینگتے اور اژدہے پھنکارتے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے سخت اضطراب تعاب کی حالت میں چلّا اُٹھا۔ "اے جوانی لوٹ آ۔ اے میرے باپ مجھے زندگی کے دروازے پر ایک بار پھر کھڑا کر دے۔ تاکہ میں اچھا راستہ اختیار کر سکوں۔"

مگر اس کی جوانی اور اس کے باپ کی زندگی دونوں گزر چکی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ دلدلوں پر شہابیے چمکے اور پھر غائب ہو گئے۔ یہ اس کی برباد گئی ہوئی عمر کے دن تھے۔ اس نے دیکھا کہ ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ یہ خود اس کا ایک نقش تھا۔ اور لاحاصل افسوس کے تیز تیز تیر اس کے کلیجہ میں آ آ کر چھدنے لگے۔ اس وقت اسے اپنے اگلے ساتھی یاد آئے جو زندگی میں اس کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ مگر جو نیکی اور محنت کے راستہ پر چل کر اب اس نئے سال کی رات کو معزز اور خوش و خرم تھے۔ اونچے مینار پر گھڑی نے گھنٹہ بجایا اور آواز نے اس کے کان میں پڑ کر اسے والدین کی (اپنے خطا کار بیٹے کے ساتھ) محبت۔ ان کی نصیحتیں اور وہ دعائیں یاد دلائیں جو انہوں نے اس کے حق میں کی تھیں۔ اور شرم اور رنج کا اس پر ہجوم ہوا۔ وہ آسمان کی طرف اس وقت زیادہ نہ دیکھ سکا۔ جہاں اس کا باپ اب رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں نے آنسو ٹپکائے اور ایک مایوسانہ کوشش کے ساتھ وہ زور سے چلّا اُٹھا۔ "لوٹ آ۔ اے میری گزری ہوئی عمر لوٹ آ۔" اور اس کی جوانی لوٹ آئی۔ کیونکہ یہ سب صرف ایک خواب تھا جو اس نے نئے سال کی رات کو سوتے میں دیکھا تھا۔ وہ ابھی جوان تھا صرف اس کے گناہ واقعی تھے۔ اس نے صدق دل سے خدائے تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔ کہ ابھی وقت قابو میں ہے۔ ابھی وہ گہرے اور اندھیرے غار میں داخل نہیں ہوا۔ بلکہ بالکل آزاد ہے

کہ اس سڑک پہ چلے جو پُرامن ملک کو جاتی ہے۔ جہاں سرسبز کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ اور جہاں آخرکار وہ ایک بیش بہا انعام حاصل کرنے کی امید کرسکتا ہے ؎

اے وہ لوگو جو ابھی تک زندگی کی دہلیز پر اس پیس و پیش میں ہو۔ کہ کونسا راستہ اختیار کرو۔ یاد رکھو کہ جب عمر گذر جائے گی اور تمہارے قدم اندھیرے پہاڑ پر ڈگمگانے لگیں گے تو نالۂ و فریاد (اور محض بے سود نالۂ و فریاد) کروگے کہ "لے جوانی لوٹ آ۔ مجھے میرے گئے ہوئے دن پھیر دو" انیس

ہر طرح سے یہ سرائے فانی دیکھی　　ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا　　جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

ریاض الاخبار۔ ۴ جنوری ۱۹۱۲ء

۷

قبولیّت و مقبولیّت

خدنگ نظر کا "قبولیّت" کو غلط مان کر "مقبولیّت" کو صحیح بتانا میری ناقص رائے میں بھی درست نہیں۔ قبولیت و مقبولیت کا صراح۔ منتخب۔ غیاث۔ منتہی الارب تاج المصادر علامہ بیہقی جیسی معتبر عربی لغات میں کہیں پتہ نہیں ہے۔ بلکہ مولانا محمد غیاث الدین نے تو مزیل الاغلاط کے حوالہ سے لفظ قبولیت کو غلط ٹھہرایا ہے۔ منتہی الارب کے اردو ترجمہ میں قبولیت کا لفظ "قبالہ" کی تعریف میں لایا گیا ہے "قبالہ (بفتح) کام کی قبولیت" مگر اس سے قبولیت کو عربیت کے اعتبار سے صحیح نہیں سمجھا جاسکتا کریم اللغات میں البتہ قبول کے ذیل میں مقبولیت بھی لکھا ہے "قبول قبولیت ع اپنا قبول کرنا" لیکن کریم اللغات ایک غیر مستند اور پایۂ اعتبار سے گری ہوئی کتاب ہے۔

---

[1] ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ کے رسالہ خدنگ نظر اور گورکھپور (حال لکھنؤ) کے ریاض الاخبار میں باہم الفاظ "قبولیت و مقبولیت" کی بحث چھڑی تھی۔ خدنگ نظر "قبولیت" کو غلط "مقبولیت" کو صحیح بتاتا تھا۔ ریاض الاخبار بقاعدۂ عربی دونوں کو غلط لیکن اردو میں ان کے استعمال کو جائز قرار دیتا تھا مگر سالک یہی کہتا تھا کہ بمقابلہ "قبول" یہ دونوں غیر فصیح ہیں اس بحث پر یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ ۱۲۹

مگر مقبولیت جس کو مغزِ خدنگ نظر نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کا وجود کریم اللغات جیسی
غیر معتبر لغت میں بھی نہیں ہے۔ غرضکہ عربیت کے لحاظ سے قبولیت و مقبولیت کو صحیح
قرار دینا بڑی غلطی ہے۔ فارسی میں بھی قبولیت و مقبولیت کی جگہ قبول ہی مستعمل ہے۔
خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ع

قبول خاطر و حسن سخن خداداد است

مولانا نورالدین جامی رحمۃ اللہ علیہ نے مقبول میں تھوڑا سا تصرف کر کے
اسے "مقبولی" بنا لیا ہے ع

بمقبولی کسے را دسترس نیست

فارسی میں قبول بمعنی مقبول بھی آیا ہے۔ سعدی

بود کہ صدر نشینان بارگاہ قبول   نظر کنند بہ بیچارگان صف نعال

لیکن باوجود عربی میں پائے نہ جانے کے اس حیثیت سے کہ قبول کی دو تصرف شدہ
شکلیں ہیں یہ دونوں لغت اردو زبان میں اس کثرت سے مستعمل اور زبان زد خاص و
عام ہیں۔ کہ ان کے ترک کرنے پر اصرار اور اردو لٹریچر سے ان کو خارج کرنا میرے نزدیک
بالکل بے جا ہے۔ اردو بہت سی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہ ضرور نہیں کہ جو لغت اصل
زبان میں جس طرح اور جس معنی میں مستعمل ہے۔ وہ اسی طرح اور اسی معنی میں اُس
زبان میں بھی مستعمل ہو۔ جس میں وہ لغت منتقل ہو کر آیا ہے۔ مثلاً اصل سنسکرت لغت
گرام (ग्राम) بمعنی گانوں ہے۔ جو اردو میں بطور ایک مہمل لفظ کے گانوں۔ کے ساتھ استعمال
ہوتا اور گراؤں بولا جاتا ہے (گانوں گراؤں)۔ (کیا تعجب ہے کہ گانوں کا ماخذ گرام ہی ہو)
عربی میں تقاضا باب تفاعل سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حالانکہ اردو میں بطور اسم کے مستعمل ہے
"حجامت" کے معنی باعتبار اصل لغت پچھنا لگانے کے ہیں۔ اردو میں اس کے جو معنی ہیں
وہ سب کو معلوم ہیں۔ پھر "زیادت" سے "زیادتی" "فضل" سے "فضیلت" کیسے بن گئے ہیں
اس لئے کوئی وجہ میری دانست میں نہیں کہ قبولیت اور مقبولیت کو عربیت کے لحاظ
سے غلط مان کر اردو زبان سے بھی ان کو نکال پھینکا جائے۔

اگر فاضل اڈیٹر ریاض الاخبار یا مولانا شبلی وغیرہ نے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا
جو اصل ماخذ کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ تو اس سے ان بزرگوں کی استعداد و علمیت

پر کسی قسم کا حرف نہیں آ سکتا۔ کسی غلط لفظ کو استعمال کرنا اور اسکو صحیح سمجھکر استعمال کرنا ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ سرسید مرحوم اپنی تحریر و تقریر میں بہت سے الفاظ اہل زبان کے محاورہ کے خلاف استعمال کرجایا کرتے تھے۔ نواب محسن الملک بہادر ہزاروں آدمیوں کے بھرے مجمع میں حضار کو یوں مخاطب کیا کرتے ہیں "صاحبو! آپ خوب جانتے ہو" "میرے عزیز بچو! آپ ابھی دنیا کے سیاہ و سفید سے بخوبی واقف نہیں ہو" بعض نہایت مستند و مشہور علما کی نسبت میں نے سنا ہے۔ کہ وہ "اِسم" کا تلفظ "اِسَم" کیا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بعض الفاظ زبان و قلم پر ایسے چڑھ جاتے ہیں۔ کہ اگر وہ غلط ہیں۔ تو استعمال کے وقت ان کی غلطی کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اور بے ساختہ اضطراری طور پر اسی طرح نکل جاتے ہیں۔ جیسی عادت پڑی ہوئی ہے۔ سچ ہے "اَلعادۃُ کالطبیعۃِ الثانیہ"

اس قسم کا اختلاف کچھ اردو ہی پر منحصر نہیں۔ قریب قریب سب زبانوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انگریزی میں بھی (جس کی تکمیل پر مغرور انگریزی قوم کو اتنا فخر و ناز ہے) بہت سے الفاظ کے تلفظ املا اور موقع استعمال وغیرہ کی نسبت سخت اختلاف ہے۔ کچھ شک نہیں کہ انسانی کلام میں ایسے اختلافات انسانی فطرۃ کے عین مطابق ہیں۔ چنانچہ خداوند تعالےٰ نے اپنے کلام کے مُنزل من اللہ ہونے کی ایک یہ بھی دلیل قرار دی ہے کہ اس میں لفظاً و معناً کسی قسم کا اختلاف نہیں وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا اہ

سب سے آخر میں "قَبول" اور اس کے موزون بہ "فَعول" کے مطرد اور شاذ ہونے کی نسبت کچھ عرض کرنے کی ناظرین سے اجازت چاہتا ہوں۔ اگرچہ فصول اکبری کی عبارت سے فعول کا شاذ ہونا مستنبط ہوتا ہے۔ دگفتہ اند کہ بغیر از پنج کلمہ بریں وزن وارد نہ گردیدہ۔ وضوء و طہور و قوع و ولوع و قبول۔ ہکذا فی الرضی۔ و علامہ تفتازانی در تلویح نوشتہ کہ بجز "قبول" مصدر دیگر بسماع نرسیدہ) لیکن فصول اکبری گو ایک مقبول اور متداول کتاب ہے۔ تاہم اس کے بعض مسائل جمہور محققین صرف کے خلاف ہیں۔ اصل یہ ہے کہ فعول کا مطرد یا شاذ ہونا سخت مختلف فیہ مسئلہ ہے علامہ زمخشری کے علاوہ احمد بن علیؒ بن مسعود نے بھی (جنہوں نے بڑا کمال یہ دکھایا ہے۔ کہ مسائل صرفیہ کو دلایل عقلیہ سے ثابت کیا ہے) فعول کو مطرد قرار دیا ہے۔ ابن کمال

پاشا نے بہ نسبت فُعول کے فَعول کو قلیل الاستعمال ٹھیرایا ہے۔ مفتی عنایت احمد صاحب مرحوم نے اپنے استاد مولوی سید محمد اعلی اللہ درجاتہ کے حوالہ سے فعول کو ثلاثی مجرد کے مطرد اوزان میں شمار کیا ہے علی ہذا سیبویہ نے۔ صاحب صراح فرماتے ہیں (قبول کی نسبت) "وہو مصدر شاذ"۔ مفتی سعد اللہ صاحب مغفور نے فعول کے وزن پر صرف آٹھ لغات مع قبول کے شمار کئے ہیں۔ جب عربی جیسی وسیع زبان میں مفتی صاحب کو اس وزن پر صرف آٹھ لغات ملے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک یہ وزن شاذ ہے۔ قرآن شریف میں قبول صرف ایک جگہ وارد ہوا ہے۔ (بقبولٍ حسنٍ) مگر اس سے سوا اس لغت کی صحت کے اور زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

امیدوار ہوں کہ ذی علم اصحاب اس مسئلہ کی نسبت اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرما کر بندہ کو مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

(ریاض الاخبار مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء)

اسلام کے مطابق تقسیم ترکہ کا دستور

"ایک ایسے زمانہ میں جبکہ فکر معاش فکر معاد پر مقدم ہے" جب کہ مذہب اور بانی مذہب پر سر بازار نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں" جب کہ مذہب کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے سے بھی زیادہ آسان" ہوگیا ہے اور جب کہ ہر شخص زمانہ کی تیز رو کے ساتھ ہاتھ پاؤں چھوڑے بہا چلا جارہا ہے۔ غالباً جناب قاضی عزیز الدین احمد صاحب کا یہ جملہ کہ "اسلام کے مطابق جو تقسیم ترکہ کا دستور ہے وہ ایسا خلاف مصلحت وقت ہے۔ الخ" کچھ زیادہ غیظ و غضب کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ اس قسم کی آزادہ نویسی کے بانی اس

---

[1] وسط ۱۹۰۴ء میں خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر نے پیسہ اخبار میں عنوان بالا سے ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں اسلام کے مطابق تقسیم ترکہ کو مضر و خلاف مصلحت قرار دیا تھا اس پر سوائے پیسہ اخبار کے باقی تمام اسلامی اخبارات نے سخت لے دے کی تھی یہ مضمون اس بحث پر نیز لکھا تھا

اخیر دور میں سرسید مرحوم تھے۔ مگر وہ نفس اسلام کو جملہ عیوب سے مبّرا اور تمام حشو و زواید سے پاک اور ہر زمانہ کے اقتضا کے موافق جانتے تھے اور مسلمانوں کے رسم و رواج اور ان کے افعال و اقوال کا جواب دہ اسلام کو قرار نہیں دیتے تھے ؛

مذہب ایک ایسی شئے ہے جو انسان کی آنکھوں پر اندھیری چڑھا دیتا ہے۔ جس سے اُسے اپنے دائیں بائیں دیکھنے اور نظر کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی بلکہ بے تحاشا اس سڑک پہ دوڑا چلا جاتا ہے۔ جو بانی مذہب نے ڈال دی ہے۔ اور اس دوڑ میں اگر اُسے سر بفلک پہاڑوں اور ناپیدا کنار سمندروں کا سامنا بھی ہو تو نہیں بھی ایک ہی جست میں پار کرنا چاہتا ہے اِس لحاظ سے بالکل قرین قیاس ہے۔ اگر قاضی صاحب کے مذکورہ بالا جملہ اور اسی قبیل کے بعض اور جملوں نے ان کے مضمون کو میرے راسخ الاعتقاد مسلمان بھائیوں کے لئے مثل لوہے کے ٹھپّے کے کر دیا ہو جس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی آگ میں رکھ دیا جائے تو پھر اس کا کوئی حصہ اس قابل نہیں رہتا کہ اُسے چھوا بھی جائے۔ لیکن میں ایسے مسلمانوں کی خدمت میں عرض کروں گا۔ کہ اگر واقعی قاضی صاحب کا "دل قوم کی حالت پر دکھا ہے" اور آپ نے "سچی" ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ" فرمائی ہے تو وہ مضمون ضرور اس قابل ہے کہ اس کی قدر اور اس کی طرف توجہ کی جائے اور اگر قابل عمل ہو تو اس کو عملی صورت میں لایا جائے۔ خذ ما صفا و دع ما کدر۔ اگر زمانہ کا اقتضا یہی ہے کہ آئندہ مسلمانوں میں ترکہ کی تقسیم عمل میں نہ لائے تو خواہ ہماری فقہ کا ایک مہتم بالشان جز علم فرایض جس کی نسبت اس لحاظ سے کہ یہ علم ایسا ہے جس کی حاجت بعد موت کے پڑتی ہے اور باقی سب علوم جیتے جی کے جھگڑے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ فَاِنَّهَا نِصْفُ ______ الْعِلْمِ-) جاتے یا ہے کوئی فرد بشر اس کا انسداد کر ہی نہیں سکتا کیونکہ زمانہ کی رفتار کو روکنا کسی فانی کے بس کی بات نہیں۔ آج سے نصف صدی پیشتر علما جس انگریزی وضع و طرز پر مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ کے فتوے لگاتے تھے اسی پر آج غیر معترضانہ سکوت کرتے ہیں۔ اور جس تعلیم کو کفر بتلاتے تھے آج اسی کو اپنے نصاب میں لازمی قرار دیتے ہیں۔ سچ ہے۔ سب سے بڑا مصلح زمانہ ہے۔ مگر یہ دیکھنا ہے کہ آیا تقسیم ترکہ کے اصول میں کوئی

بھی ایسی بات ہے جس سے اس کا استیصال مفید ٹھیرتا ہو۔ کیونکہ جب تک کوئی رسم غیر مفید اور مضر ثابت ہو کر اس کی بجائے دوسری مفید رسم قایم نہ ہو جائے اس وقت تک زمانہ اس کو ترک کر نہیں سکتا۔

اسلام نے اپنے نہایت منصفانہ اور بے نظیر اصول کے موافق کسی حق دار کو اس کے جائز حق سے محروم نہیں کیا۔ بڑا بھائی محض اس وجہ سے کہ وہ بڑا ہے اپنے چھوٹے بھائی کی نسبت ایک حبہ زیادہ نہیں پا سکتا نہ بہن مجرد اس وجہ سے کہ "وہ پرائے گھر کی" ہے۔ اپنے واجبی حصہ سے محروم ہو سکتی ہے۔ اور دل پر تو کسی کا اختیار نہیں لیکن ظاہری برتاؤ میں ماں باپ کو بھی یہ کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا۔ کہ بلا وجہ اولاد میں کسی قسم کا فرق کریں۔ اگر کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ خاندان کا ایک شخص دوسروں کے حصوں پر قابض رہے۔ تو ضرور وہ اور حق داروں کو محروم کر کے جائداد کو اپنے ہی حق میں منتقل کرنے کی کوشش کرے گا اور ایسی حالت میں کہ وہ کل ریاست پر حاوی ہو رہا ہے۔ ایسا کرنا اس کے لئے کچھ دشوار نہ ہوگا۔ چنانچہ ملا جلال الدینؒ نے اخلاق جلالی کے حصہ سیاست مدن میں اس مضمون کی ایک فلسفیانہ تقریر کی ہے کہ "خدمت ہمیشہ بالغرض ہوا کرتی ہے" اور ظاہر ہے کہ ریاست و جائداد کے سوا اس کے اور کون سی غرض متعلق ہو سکتی ہے کہ غیروں کے حقوق کو دیو حرص و خود غرضی کے بھینٹ چڑھایا جائے۔ چار بھائیوں میں ناممکن ہے۔ کہ سب ایک ہی طبیعت کے ہوں۔ اگر دو ناقص العقل ہیں۔ تو دو ضرور ایسے ہوں گے جنہیں دنیا کی شرم ہوگی اور اپنی حوصلہ مندی سے اپنے حصہ کو ترقی دینے کی کوشش کریں گے پس نہایت بے جا ہے کہ انہیں اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھانے سے جبراً باز رکھا جائے۔ اگر بھائی آپس میں نباہ ہوتا جانیں تو اسلام نے انہیں تقسیم حصص پر مجبور بھی نہیں کیا۔ بلکہ اپنے عادلانہ اصول کے ساتھ اتفاق و اتحاد کی طرح طرح سے تاکید فرمائی ہے خداوند تعالےٰ جل شانہ نے جہاں مسلمانوں کو صلح و آشتی کی تاکید فرمائی ہے وہاں انہیں بھائی بھائی فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کا یک دلی و یک جہتی کے ساتھ رہنا خداوند کریم کی مرضی کے عین مطابق ہے۔ مانا کہ تقسیم سے ایک کا بجائے چار حصے ہو گئے۔ مگر گھی کہاں گیا؟ کھچڑی میں۔ چاروں حصوں کے مالک مسلمان ہی تو

ہیں۔ البتہ اگر ان میں سے کوئی حصہ مسلمان بھائی کے قبضہ سے نکل جائے۔ تو ضرور افسوس کی بات ہے۔ لیکن اس کی وجہ تقسیم ترکہ نہیں بلکہ اور ہی اسباب ہوں گے۔ جہاں بڑے بھائیوں کا دور دورہ ہے وہاں خاندانی عزت کی جگہ ذاتی اور شخصی جاہ و حشم لے لیتا ہے۔ اور سب بھائیوں کی یکساں عزت جو باپ کے ہوتے ہوتی ہے۔ وہ برادر مکرم کے عہد مبارک میں کافور ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں اگر وراثت کا قاعدہ صرف اس وجہ سے ناقابل عمل ہے کہ چند پشتوں کے بعد اولاد بالکل مفلس ہو جاتی ہے تو یہ صورت اس حالت میں اور بھی جلد پیش آ جائے گی کہ اس قانون پر عمل کیا جائے۔ مثلاً جیکب نامی ایک شخص مرا اور اس نے چار بیٹے جوزف جیمس جارج اور جان چھوڑے بڑا بیٹا جوزف اپنے باپ کی جائداد پر قابض ہوا جس کی آمدنی فرض کر لیجئے ایک لاکھ پونڈ سالانہ کی ہے اب جوزف بارہ ہزار پونڈ سالانہ اپنے تینوں بھائیوں جیمس جارج اور جان کو "معمولی گذارہ" کے لئے دیتا ہے اور باقی اپنی "خاندانی عزت" پر صرف کرتا ہے۔ پھر اب ان تینوں کے اگر چار ہی چار بیٹے ہیں تو ہر بیٹے کو اپنے باپ کے بعد ایک ہزار پونڈ سالانہ ملیں گے۔ خیال فرمائیے کہ جس دادا کی آمدنی ایک لاکھ پونڈ سالانہ کی تھی اس کے پوتوں کی صرف ہزار پونڈ سالانہ ہے لیکن ہماری شریعت کے مطابق اگر تقسیم عمل میں آئے تو انہیں پوتوں کی آمدنی چھ ہزار دو سو پچاس پچاس کی ہوگی ؛

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

میں تسلیم کرتا ہوں کہ رعایا کے دنیوی حقوق گورنمنٹ نے اپنے ساتھ مخصوص کر لئے ہیں۔ لیکن وہ حقوق کیا ہیں ؟ مال گزاری کا وصول کرنا امن و امان قایم رکھنا دنیوی معاملات کے لئے عدالتوں کا قایم کرنا عہدہ داران ملکی کا تقرر کرنا۔ یہ اور خاص اسی قسم کے امور ہیں جو گورنمنٹ نے اپنے اختیار میں لئے ہیں۔ مگر پھر بھی میراث وغیرہ کے معاملات کا دارومدار نہایت دانشمندی سے ہر فرقہ کے مذہبی قانون ہی پر رکھا ہے ؛

برٹش گورنمنٹ نے بیچ ملک میں جو سینکڑوں چھوٹی بڑی خود مختار ریاستیں لگا رکھی ہیں۔ اور ان کو قابل وراثت نہیں رکھا اس میں ایک بہت بڑی پولیٹیکل مصلحت یہ ہے کہ ہندوستانی گھر بیٹھے مختلف حکومتوں کا رنگ ڈھنگ اور طرز دیکھ کر برٹش گورنمنٹ کی عدل پروری کی قدر کریں۔ جو بزرگ یہ سوال کرتے ہیں کہ

اسلامی قانون وراثت کے مطابق سلطنتیں قابل تقسیم کیوں نہیں شاید ان کی نظر اس پر نہیں کہ یہ سلطنتیں اس عہد کا مٹا ہوا نقش ہیں۔ جب کہ سلطنتیں کسی خاص ذات کا حق نہیں ہوتی تھیں سید القوم خادمھم ہوتا تھا اور خلافت کی باگ جمہور کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ تاریخ عالم کے مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی ملک میں جب کبھی دو شخصوں کو سلطنت پر قابض ہونے کے لئے قسمت آزمائی کا موقع ملا ہے۔ تو ضرور خون کی ندیاں بہ گئی ہیں۔ انگلستان میں جہاں اب ہمارے حکمرانوں کے اقبال سے پولیس کے ایک ادنے سپاہی کی انگلی کشت و خون کو آن واحد میں روک دیتی ہے وہیں ہپٹارکی" (سات سلطنتیں) کے زمانہ میں "بریٹوالڈا" (حامل برطانیہ) بننے کے لئے ان سات سلطنتوں کے بادشاہ ملک میں کیسی قیامت برپا کرتے تھے قدرت نے جو سلسلہ تفوق کا قایم کر رکھا ہے وہ اسی کا مقتضی ہے کہ دو برابر کی طاقتیں محل واحد میں جمع نہ ہونے پائیں وللہ در من قال "دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"۔ یہ اعتراض کرنے والا فریق جس صیغہ میں اپنی جیت دیکھتا ہے اُسی کو اختیار کرتا ہے" اس کی یہ صورت ہے کہ لڑائی جھگڑے دنگے فساد کسی کے بس کے نہیں۔ شمعون[1] اسمائلس کا قول ہے کہ "قوانین خواہ کیسے ہی عادلانہ ہوں۔ جرایم کو موقوف نہیں کر سکتے جس گناہ کی بنیاد پڑ چکی وہ قیامت تک نہیں مٹ سکتی البتہ اس کی شکل بدل جاتی ہے"۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جائداد اور دولت قابل قدر چیزیں نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ؎

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

لیکن یہ کہنا کہ ساری دنیاوی عزت و آبرو دولت ہی کی بدولت ہے۔ محض خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ آج بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ وہ لوگ جو آمدنی اور مال و دولت کے لحاظ سے تو کچھ نہیں لیکن قوم اور ملک میں اتنے عزیز ہیں کہ اگر ان کی عزت و وقعت پر رشک کیا جائے تو عین صواب ہے۔ نہ میونسپل کمشنری دولت جائداد پر منحصر ہے نہ آنریری مجسٹریٹی نہ کونسل کی ممبری۔

میں مانتا ہوں کہ چھتاری[2] اور دتاولی کے عالی شان علاقے تقسیم ہو کر نسبتاً

---

[1] مشہور انگریزی مصنف جس کی اخلاقی کتابیں بہت مقبول ہیں۔ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۲۹۷
[2] یہ صوبجات متحدہ کے دو مشہور زمینداری علاقے ہیں۔ ۱۲۹۷

چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوگئیں۔ مگر ایسی بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ اولاد نے واجبی ترکہ پایا مگر اپنے حصوں کو ترقی دے کر باپ کی جائداد سے اپنے دست و بازو کا پیدا کی ہوئی جائداد کو ڈیوڑھا دونا کر لیا۔ اپنے اس دعوے کی تائید کی غرض سے بخاری اور دنادلی کے قریب ہی کی، ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس سے قاضی صاحب بھی بخوبی واقف ہیں۔ مشہور[1] زمانہ رئیس بھیکن پور ضلع علی گڑھ کے مورث باز خاں ہیں۔ باز خاں کے تین بیٹے تھے۔ حاجی محمد داؤد خاں۔ محمد خان زمان خاں اور محمد خاں۔ ان میں سے ہر وارث نے اپنے حصہ کو مورث کے ترکہ سے المضاعف سے کم نہ بڑھایا ہوگا۔ ان سب کا فرداً فرداً حال لکھنا طوالت سے خالی نہیں۔ اس لئے میں صرف بڑے بیٹے محمد داؤد خاں صاحب مرحوم کو لیتا ہوں۔ مرحوم کے دو بیٹے تھے حاجی محمد غلام احمد خاں اور محمد عنایت اللہ خاں۔ چھوٹے بھائی محمد عنایت اللہ خاں نے بڑی نمایاں ترقی کی اور حصہ کو المضاعف کر لیا۔ بڑے بھائی حاجی محمد غلام احمد خاں کے حصہ کی حالت قریب قریب بدستور رہی۔ حاجی محمد غلام احمد خاں مرحوم کے دو نرینہ وارث ہوئے یعنی حاجی محمد احمد سعید خاں صاحب اور خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب۔ ان بھائیوں کے حصہ کی کیفیت خود حاجی محمد احمد سعید خاں صاحب کے لکچر سے اقتباس کر کے لکھی جاتی ہے:-

"صاحبو! میرے باپ نے جس وقت انتقال کیا ہے جس کو زمانہ چودہ سال کا گذرا ساڑھے چودہ ہزار روپیہ سالانہ منافع کی جائداد چھوڑی تھی۔ جو اس وقت بشرکت ہم دونوں بھائیوں کے قریب ساٹھ پینسٹھ ہزار روپیہ سالانہ کی ہے ...... کچھ روز اول اس سے ہم دونوں بھائیوں کا مشترکہ منافع ۳۶ ہزار روپیہ سالانہ تھا جس کو میں نے باہم تقسیم کر کے ۲۷ ہزار اپنے چھوٹے بھائی مزمل اللہ کو دے دیا اور نو ہزار کا میں نے لیا .... میرا اس وقت منافع ۲۰ ہزار روپیہ سالانہ کا ہے۔" (علی گڑھ کالج میگزین بابت اگست سنہ ۱۹۰۱ء) سنہ ۱۹۰۷ء سے اب تک جو چھ برس کا عرصہ ہوا اس میں خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے اپنی

---

[1] مجھے دلی افسوس ہے کہ قاضی صاحب کی مہربانی سے میں اثبات پر بحث کرنے سے مجبور ہوا۔
۱۲۹۶

خدادا د قابلیت اور سیاست دانی سے حیرت انگیز ترقی کی ہے لاگرچہ اپنے چھوٹے بھائی خان بہادر ممدوح سے دوسرے درجہ پر لیکن ترقی میں حاجی محمد احمد سعید خاں صاحب نے بھی معتد بہ حصہ لیا ہے۔ مذکورہ بالا کوٹیشن سے قاضی صاحب کا یہ اعتراض بھی دفع ہوتا ہے کہ تقسیم سے خاندان کو نقصان پہنچتا ہے۔ حاجی محمد غلام احمد خاں صاحب کا انتقال ۱۸۹۸ء منفی ۱۴ سال، تقریباً ۱۸۸۴ء میں ہوا۔ اس وقت دونوں بھائیوں (حاجی صاحب و خان بہادر) کی آمدنی ساڑھے چودہ ہزار تھی تقریباً ۱۸۹۵ء تک (جیسا کہ الفاظ "کچھ روز اول اس سے" سے مفہوم ہوتا ہے) خاندان مشترک رہا اور آمدنی ساڑھے چودہ ہزار سے ترقی کر کے ۳۴ ہزار تک پہونچی۔ ترقی کا اوسط فی سال ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۵ء تک ایک ہزار نو سو پچپن رہا۔ حاجی محمد احمد سعید خاں نے ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک تین سال میں نو ہزار سے بیس ہزار تک ترقی کی اور خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے ۲۷ ہزار سے ۴۵ ہزار تک۔ جس کا اوسط علی الترتیب تین ہزار چھ سو چھیاسٹھ اور چھ ہزار فی سال ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جو ترقی ارکان خاندان کے مشترک نہ ہونے کی حالت میں ہو سکتی ہے وہ دوسری صورت میں نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ باوجود تقسیم نہ ہوتے اور یک جائی ہونے کے اور ذات واحد کے ذی اختیار رہنے کے کوئی نمایاں ترقی نہیں ہو سکی ؛

ہندوستان میں ہندو مسلمان دو ہی قوموں کا ترقی میں مقابلہ ہے۔ اور جب ہندوؤں کے مذہب میں بھی تقسیم ترکہ کا قانون موجود ہے۔ تو پھر نہیں معلوم قاضی صاحب نے صرف مسلمانوں ہی کے مذہبی قانون کو کیوں مورد اعتراض قرار دیا۔ ہندوؤں میں عورت مذہباً محروم رہتی ہے اور مسلمانوں میں رسماً۔ نتیجہ ایک ہی ہے۔ کاش! مسلمان رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہو کر خدا کی رسّی کو مضبوط پکڑیں۔ قاضی صاحب شاید واقف نہیں ہیں کہ ان چھتاری اور دتاؤلی کے علاقوں کے بعض حصہ دار برابر اپنے حصوں کو ترقی دے رہے ہیں ؛

ایک شکایت بالکل عجیب قسم کی ہے کہ "مسلمان کثیر الاولاد ہوتے ہیں" حالانکہ کسی قوم کا کثیر الاولاد ہونا اس کے اقبال مند اور ترقی حال ہونے کی دلیل ہے چنانچہ

اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمان بہت کثیر الاولاد ہوتے تھے۔ اور یہی حال اب یورپین قوموں کا ہے مشہور مقنن ڈالنشیر الفرڈ کا قول ہے "کہ پولیٹیکل نظر سے ہر ایک قوم وملت کے واسطے کثرت آبادی کی ایسی قطعی ضرورت اور حاجت ہے کہ اس سے انکار کرنا ناممکن ہے" اس امر کے ثبوت میں کہ حال کے چند متواتر قحطوں کو ہندوستان کے دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں نے نہایت دلیری اور فراخ حوصلگی سے برداشت کیا ہفتہ وار پیسہ اخبار کے جون ۱۹۰۴ء کے کسی نمبر میں بڑے زور سے دکھایا گیا تھا کہ مسلمانوں نے توالد وتناسل کے سلسلہ کو بدستور جاری رکھا۔

یہ کہنا کہ "انگلستان میں جس قدر آدمی زیادہ امیر اور دولت مند ہو اسی قدر اس کا لڑکا زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل ہوگا" تجربہ کے خلاف ہے جو قابلیت اور عزت ووقار اوسط طبقہ کے لوگ حاصل کر لیتے ہیں۔ امیروں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ امرا ہر جگہ کاہل اور عیش پسند ہوتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

ہاں یہ بات دوسری ہے کہ کاہلی اور عیش پسندی ہندوستان کی آب وہوا میں داخل ہے۔ جو حکام انگریزی ہندوستان میں عرصہ تک رہتے ہیں۔ وہ نسبتاً عیش پسند اور آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کے گورے سپاہی جن کو چستی چالاکی کی زیادہ ضرورت فوجی کاموں کے لئے ہوتی ہے۔ ہندوستان میں چند سال سے زیادہ نہیں رہنے دئیے جاتے۔ ہر ملک اور قوم کی ریڑھ کی ہڈی اس کا طبقہ اوسط ہوا کرتا ہے۔ فضول خرچی کا ذمہ دار قانون وراثت کو ٹھہرانا کسی طرح درست نہیں کیونکہ اسلام نے میانہ روی کی تاکید فرمائی ہے اور اسراف کی مذمت۔ مبذرین کو اخوان الشیاطین ٹھہرایا ہے۔ اگر فضول خرچی کا سبب قانون وراثت ہے۔ تو انگلستان کے امیر کیوں فضول خرچ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں نے گولڈ اسمتھ کا ڈزرٹڈ ولیج پڑھا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ اس نے ان امیروں کا کیا کچھ رونا رویا ہے۔ انگلستان کے کے امیروں کے اسراف کی ایک ادنے مثال یہ ہے کہ ایک امیر کبیر نے اپنے بیٹے کے لئے ایک عظیم الشان جائداد اور رقم چھوڑی۔ صاحب زادہ نے تھوڑے ہی دن میں ساری دولت اور جائداد برباد کر کے قرض و دام تک نوبت پہنچائی۔ جب اس سے بھی کام نہ چلا تو چوری اور رہزنی پر کمر باندھی۔ نوبت بایں جا رسید کہ جیل خانہ

پہونچے جیل خانہ میں اس امیر زادہ نے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بتایا ہے۔
کہ کیونکر وہ بے شمار دولت صرف اٹھارہ مہینے کے قلیل عرصہ کے اندر خاک میں
مل گئی ؁

علی گڑھ منتھلی میں ایک بار ریڈیکل کے خفیہ نام سے ایک صاحب نے عربی لٹریچر
کی نسبت لکھا تھا کہ "اس میں اونٹ کی مینگنیوں کی تعریف کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے"
بعینہ اسی قسم کا دعوے قاضی صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ کہ "اب سے ۱۱سو
برس پہلے عرب میں جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ اب ہماری حالت نہیں ہے۔
اس زمانہ میں مسلمانوں کے مقبوضات محدود تھے اور ان کی جائداد مختصر چند اونٹ
کھجور کے درخت یا غلام ان کو جس طرح چاہا بانٹ لیا" اب سے جو ۱۳۲۲ھ ہے
گیارہ سو برس پہلے کا اگر ہم تصور کریں تو ۲۲۲ھ پر پہونچتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ
بنی عباس بغداد اور بنی امیہ مروانیہ قرطبہ میں مسند خلافت پر جلوہ افروز ہیں۔
طبا طبائی بصرہ میں بنی زیاد یمن میں اور آل طاہریاں خراسان میں اپنے ٹھاٹھ
جمائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا سراسر ظلم ہے کہ مسلمانوں کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔
فتوحات کی وسعت کے ساتھ ان کا تمول برابر روز افزوں ترقی پر تھا ان پیشوں
اور حرفوں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ جن میں خیر القرون کے اکابر مسلمین مصروف
تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جس وقت مشرف باسلام ہوئے ہیں تو چالیس ہزار درہم
مسلمانوں کی امداد کے لئے دئیے تھے "عمر بن شبہ نے کتاب المدینہ میں بسند صحیح
روایت کی ہے کہ نافع جو حضرت عمرؓ کے غلام تھے۔ کہتے تھے کہ عمرؓ پر قرض کیوں کر
رہ سکتا ہے حالانکہ ان کے ایک وارث نے اپنے حصہ وراثت کو ایک لاکھ پر بیچا تھا"
حضرت عثمانؓ غنی کا غنا اس قدر مشہور ہے کہ ان کے لئے کسی سند و حوالہ کی ضرورت
نہیں ہے۔ ان تمام معتبر شہادتوں کے بعد غالباً اس شبہ کی گنجائش نہیں رہے گی
کہ مسلمان صرف چند اونٹوں اور کھجور کے درختوں ہی کے مالک تھے۔ اور ان کے پاس
وراثت کے واسطے کافی سرمایہ موجود نہ تھا؁

اب اپنی ناقص رائے میں مجھے صرف ایک امر کی نسبت رفع شک کی اور
حاجت باقی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ "ادھر ہیں مہر کی کثرت سے صدہا خاندان تباہ ہوگئے"

ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے ہرگز اجازت نہیں دی کہ مہر اتنا مقرر کیا جائے۔ جو تباہی کا باعث ہو۔ یہ صرف ہماری جہالت کا قصور اور ناقص رسم و رواج کا مہلک اثر ہے جو زمانے نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ مہر ادا کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ جتنا بھی چاہے۔ بلا لحاظ حیثیت کے باندھ دیا جائے۔ قرون اولیٰ میں مہر کے حسب حیثیت ہونے کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ بی بی فاطمہ رضؓ کا مہر کیا تھا؟ صرف دس درہم۔ دوسری طرف دیکھئے حضرت عمرؓ نے مولا علی کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے نکاح کیا ہے تو مہر چالیس ہزار تھا۔ (ریاض الاخبار مورخہ ۱۶ و ۲۰ ستمبر ۱۹۰۲ء)

تقویٰ کے معنی اور متقی کی حقیقت

بعض الفاظ اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے بالوضع کچھ ایسے طویل الذیل ہوتے ہیں کہ ان کا ایک معنی اور مفہوم پر استقرار دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہوتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے محقق اور غیور عالموں کو بھی وہ اپنا چہرہ صاف نہیں دکھاتے۔ ازاں جملہ الفاظ "تقویٰ" اور "متقی" ہیں جن کی نسبت یہ کہنا غالباً ایک حد تک صحیح ہوگا کہ ان کی تفسیر میں دو مفسر بھی بمشکل متحد اللفظ ہوں گے۔ مگر صاحب[1] کتاب غنیۃ الطالبین نے معنی تقویٰ اور حقیقت متقی کی نسبت مختلف بزرگوں کے اقوال شریفہ نہایت بیت کے ساتھ نقل کئے ہیں جن کو عربی سے ترجمہ کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم — تم میں سب سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہی ہو جو سب سے زیادہ متقی ہے

تقویٰ کے معنی اور متقی کی حقیقت کی نسبت علما نے اختلاف کیا ہے چنانچہ نبی صلعم کی نسبت منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ سارا تقویٰ خدائے عزوجل کے اس قول میں بھرا ہوا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ — کچھ شک نہیں کہ اللہ حکم دیتا ہے انصاف اور نیکی اور قرابت رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا اور منع کرتا ہے بے شرمیوں اور بری باتوں اور نافرمانی سے تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم

---

[1] حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ۔ ۱۲۹۷

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ "متقی وہ ہے جو شرک اور کبیرہ گناہوں اور فواحش سے بچے" ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "تقوے یہ ہے کہ تو اپنے نفس کو کسی سے بھی اچھا نہ پائے" حسن علیہ الرحمۃ ارشاد کرتے ہیں کہ "متقی وہ یہ ہے کہ جسے دیکھے اسی کو کہے کہ یہ مجھ سے اچھا ہے" حضرت عمر بن خطابؓ نے کعب احبار سے پوچھا کہ "فرمائیے تقویٰ کس شئے کا نام ہے"؟ پوچھا "کبھی آپ خار دار راستہ میں بھی چلے ہیں"؟ فرمایا "ہاں" کعب احبار نے پوچھا کہ "تو پھر آپ نے وہاں کیا کیا۔ کہا "احتیاطاً دامن سمیٹ لئے" کعب بولے "بس یہی تو تقویٰ ہے" اسی کو کسی شاعر نے نظم کیا ہے۔

خل الذنوب صغیرھا وکبیرھا فھو التقیٰ — چھوٹے بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے

واصنع کماش فوق ارض الشوک یحذر ما یریٰ — اور خار دار زمین پر چلنے والے شخص کے موافق عمل کرو جو چیز اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اس سے بچتا ہے

لا تحقرن صغیرۃ ان الجبال من الحصیٰ — چھوٹے آدمیوں کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں

خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کا ارشاد ہے کہ تقویٰ دن بھر روزہ رکھنے یا رات بھر نماز پڑھنے یا ان دونوں کو ملا دینے (یعنی دن کا روزہ بھی اور رات کی نماز بھی) کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ خدا کی حرام کی ہوئی چیز کو چھوڑنے اور اس کے فرض کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ خداوند کریم عطا کرے وہی خیر محض ہے۔" بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ متقی وہ ہے جو نفس کی پیروی سے بچے۔ مالکؒ فرماتے ہیں۔ کہ "وہب بن کیسان نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ اہل مدینہ میں سے کسی فقیہ نے عبد اللہ بن زبیر کو لکھا تھا کہ متقیوں کی چند علامتیں ہیں جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں مصیبت کے وقت صبر۔ رضا بقضا۔ شکر نعمت۔ اور اہل قرآن کے ساتھ بفروتنی پیش آنا" ابو درداؓ فرماتے ہیں

یرید العبد ان یعطی مناہ — انسان تو یہ چاہتا ہے کہ میری مرادیں پوری ہوں

ویابی اللہ الا ما اراد — مگر اللہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

یقول المرء فائدتی ومالی — آدمی اپنے فائدہ اور مال و دولت کو ڈھونڈتا ہے

وتقوی اللہ احسن ما استفاد — حالانکہ خوف خدا اس کے مطلوبہ فائدہ سے بہتر ہے

مجاہدؒ ابو سعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "مجھے کچھ نصیحت فرمائیے" آپ نے فرمایا کہ "خوف خدا کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ یہی تمام بھلائیوں کا مجموعہ ہے۔ جہاد میں کوشش کرو۔ کیونکہ یہ اسلام میں

ایک قسم کی رہبانیت ہے۔ اور ذکر خدا کو اختیار کرو۔ اس لئے کہ وہ تمہارے واسطے نور ہے" اور اتقا کی حقیقت اللہ عزوجل کی بندگی کے ذریعہ اس کے عذاب سے بچنا ہے۔ لوگ کہا کرتے ہیں اتقی فلان بترسہ یعنی فلاں شخص اپنے ڈھال کے ذریعہ سے بچا۔

اصل تقویٰ شرک سے پھر اس کے بعد گناہوں اور برائیوں سے پھر اس کے بعد فضولیات کو چھوڑنا ہے اور اللہ تعالےٰ کے اس قول کی تفسیر میں کہ

اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ ڈرو اللہ سے جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے

وارد ہوا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد رکھا جائے۔ بھلایا نہ جائے۔ اور اس کا شکر کیا جائے۔ کفران نعمت نہ کیا جائے۔ سہلؒ کا قول ہے کہ "جو شخص چاہے کہ میرا تقویٰ درست ہو جائے اُسے چاہئے کہ سارے گناہ چھوڑ دے" اور تقویٰ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بندگان خدا پر ظلم کرنے اور اُن کے حقوق سے سبکدوشی حاصل کرے۔ پھر کبیرہ اور صغیرہ گناہوں سے۔ اس کے بعد دل کے گناہوں کے چھوڑنے کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ یہی گناہوں کی جڑ اور اصل ہیں۔ اور انھی سے ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ اعضائے انسانی سے متعلق گناہ پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ریا۔ نفاق۔ عجب۔ کبر۔ حرص۔ طمع خلق کا ڈر اور اس سے امید اور مرتبہ اور سرداری کی تلاش اپنے ہمجنسوں پر فوقیت وغیرہ۔ جن کی شرح طوالت سے خالی نہیں۔ اور ان سب پر انسان نفس کی مخالفت کے ذریعہ سے غالب آسکتا ہے۔ بعد ازاں ترک ارادہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ پس چاہئے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ کرے۔ نہ اس کے کام میں اپنی رائے شامل کرے۔ نہ اُس کے اوپر کسی کو فوقیت دے۔ نہ اپنی روزی کی جہت و سبب میں کھود کرید کرے نہ اُس کی خلق کی نسبت اس پر اعتراض کرے۔ بلکہ ہر چیز کو اس کے سپرد کرے۔ اور اس کے سامنے گردن جھکائے۔ اور اپنی جان اسے سونپ دے۔ اس کے بعد وہ خدا کے دست وقدرت میں مثل دودھ پیتے بچے کے ہوتا ہے۔ جو اپنی دائی یا کھلائی کی گود میں ہو یا مثل میت کے ہوتا ہے۔ جو غسل دینے والے کے ہاتھ میں بالکل بے اختیار اور بے قابو ہوتا ہے۔ اس کے بعد مصنفؒ نے حصول نجات کے طریقہ پر ایک مختصر ریمارک کیا ہے۔ مگر چونکہ وہ اس مضمون کے مقصد سے خارج ہے اس لئے اس کو قلم انداز کرتا ہوں۔ (۱۲۹۷)

دبدبۂ سکندری ۱۹ ستمبر ۱۹۰۴ء

۱۰

تقریر و تحریر کا ڈھنگ

انسان اور قوت گویائی کی خلقت کی تاریخ بالکل ایک ہے۔ آدمؑ کا سب سے پہلا کلام خدائے تعالیٰ کے ساتھ تھا۔ اگر انسان کے پاس خیالات کے اظہار کا یہ مبارک ذریعہ نہ ہوتا تو یہ بات بالکل آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کے کل کام ابتر اور اس کے سارے منصوبے بالائے طاق ہوتے۔ مگر باوجود اس قدر مفید ہونے کے دیگر انسانی قوتوں کی طرح یہ قوت گویائی بھی نقصان سے خالی نہیں۔ آنکھ ہے کہ دیوار کی اوٹ میں کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتی۔ کان ہیں کہ ان کے لئے آواز اور فاصلے میں تناسب ضروری ہے یہی حال اس قوت کا ہے۔ دور بیٹھے ہم اُسے کام میں لاسکیں یہ قطعاً ناممکن ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب قوت گویائی کے اس نقص سے کاروبار میں فرق آنے لگا تو انسان نے فن کتابت ایجاد کیا۔ آپ شاید یہ خیال کرینگے کہ تحریر کا ابتدائی ڈھنگ بھی یا کم سے کم اسی موجودہ طرز کے قریب قریب ہوگا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اُس وقت انسان کو ہر خیال کے لئے ایک جدا تصویر بنانی پڑتی تھی چنانچہ اہرامِ[1] مصری کے کتبے اس کی زندہ مثال ہیں۔ اس خط کو ہائروگلفکس (یونانی الاصل لفظ بمعنی مقدس تحریر) کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص لکھتا ہے کہ "دشمن رات میں دریا کے راستے آیا"۔ تو وہ شیر (دشمن)، چاند (رات) اور کشتی (دریا)، کی تصویریں بنائیگا۔

بولنے سے زیادہ آسان اور کون سی چیز ہوسکتی ہے اور بظاہر اس کے لئے کسی قواعد کی ترتیب کی ضرورت نہیں۔ مگر اس زمانہ میں جب کہ ہر چیز ترقی کر کے اپنے معراج کمال پر پہونچ گئی ہے تحریر تو ایک طرف تقریر کے بھی اصول مدون ہوگئے ہیں۔ جب تک کوئی مقرر دوران تقریر میں مناسب موقع ہاتھوں وغیرہ اعضا کو جنبش نہ دے اس کی تقریر سامعین کے دلوں پر قرار واقعی اثر نہیں پیدا کرسکتی۔ لارڈ بیکنسفیلڈ[2] کی تقریر کے پُراثر ہونے کی

---

[1] یہ مصر میں فراعنہ کے عہد کے نہایت قدیم مخروطی شکل کے متعدد اور مختلف بلندی کے مینار ہیں۔ ۱۲۹۷

[2] ایک سابق وزیر اعظم انگلستان اور ملکہ وکٹوریہ آں جہانی کے عہد کا مشہور مدبر۔ ولادت ۱۸۰۴ء۔ وفات ۱۸۸۱ء۔ ۱۲ ۹ ۷ -

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے چہرے کی ہیئت کو مناسب وقت تبدیل کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا اور یہ کمال اس نے سالہا سال تھیٹر میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ علیٰ ہذا یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ بلاغت ایک اکتسابی فن ہے اور فصاحت سے سعدیؒ

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگرچہ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں اور رسالے موجود ہیں مگر ریورنڈ اڈورڈ ایورٹ ہیل[1] صاحب نے اس پر نہایت مختصر الفاظ میں بالکل نرالی طرز سے بہت پر لطف بحث کی ہے۔ جسے ہم کسی قدر تصرف کے ساتھ ذیل میں دیتے ہیں (تصرف کے ساتھ اس لئے کہ اردو کے مذاق کے موافق ہو سکے) وہ یہ ہے:۔

"جب کبھی مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے تو میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے یہ خیال کروں کہ آخر مجھے کیا لکھنا ہے۔ دس لکھنے والوں میں نو ایسے ہوتے ہیں۔ جنہوں نے گویا یہ سبق کبھی پڑھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ اخباروں کے لئے لیڈنگ آرٹیکل لکھتے ہیں ان میں سے اکثر شروع کرنے کے بعد آدھے وقت تک بھی نہیں سمجھتے کہ ہمیں کہنا کیا ہے اور میں نے بہت سے ایسے لکچر سنے ہیں جو بظاہر اُن لوگوں کے لکھے ہوئے تھے جو ابتدا کرتے وقت صرف اتنا جانتے تھے کہ ہمارا عنوان کیا ہونا چاہئے۔ چنانچہ جب قلم اٹھایا تو مضمون ان کے لئے ایک قسم کی چیستاں تھا اور انہیں حیرت تھی کہ اس کیونکر عہدہ برآ ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا تو ایک نہایت معزز جنٹلمین کبھی کبھی ہمارے اسکول میں لکچر دیا کرتے تھے وہ بغیر کچھ سمجھے بوجھے کہ مجھے کہنا کیا ہے اپنے لکچر شروع کر دیتے تھے۔ اور انھیں پورا یقین ہوتا تھا کہ پہلے جملہ کا آخری حصہ مجھے دوسری جملہ پر پہونچا دے گا۔ اس کی مثال یہ ہے:۔

"میرے پیارے نوجوان دوستو! میں نہیں جانتا کہ مجھے آپ سے کچھ بھی کہنا ہے مگر میں آپ کے استادوں کا نہایت ممنون ہوں جنھوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ آج صبح کے وقت میں آپ لوگوں کے سامنے کچھ کہوں۔ صبح رات کی فرحت و تازگی کے بعد

[1] ایک امریکن پادری ولادت ۱۸۲۲ء۔ وفات وسط ۱۹۰۹ء ۱۲۹۷

کچھ ایسی خوشنما ہے کہ جس وقت میں گرجا کی طرف گیا اور ادھر ادھر نگاہ کی اور ستارہ ہو ا کھائی تو ہمیشہ سے زیادہ مجھے یہ امر محسوس ہوا کہ ایسی عجیب دنیا میں رہنا کتنا مفید ہے۔ کیونکہ دنیا کو اے پیارے بچو! اس طاقت نے ہمارے لئے بنایا اور ترتیب دیا ہے۔ جو ہماری قوت سے کہیں بڑھ کر ہے تاکہ ہم اپنی زندگی سے حظ اٹھا سکیں اور اپنے بہن بھائیوں کی خوشی خرمی اور فائدے کے لئے کوشش کر سکیں۔

بہن بھائی تو یہ ہمارے ضرور ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض دور دراز ملکوں میں رہتے ہیں۔ اور اور آسمانوں کے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور لمبے چوڑے سمندروں نے انہیں ہم سے جدا کر دیا ہے۔ یہ سمندر حقیقتہً دنیا کو جتنا ملاتے ہیں اتنا جدا نہیں کرتے وہ اسے بالکل ایک کئے ہوئے ہیں جو ہوائیں اُن پر چلتی اور جو موجیں اُن کے پانی کو حرکت دیتی ہیں وہ ایک اعلیٰ تر قانون کی محکوم ہیں تاکہ تجارت اور انسان کی نفع رسانی میں حصہ لے سکیں۔ اور انسان میرے پیارے بچو! وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔"

آپ دیکھتے ہیں کہ اس کا کہیں سلسلہ ہی نہیں ٹوٹتا خود اپنے ساتھ یہ ایک طرح کی بیت بازی ہے کہ ایک جملہ کے آخری لفظ یا آخری خیال کو لے کر اسی سے دوسرا جملہ شروع کر دیا۔ مگر اس کا کچھ بھی خیال نہیں کہ آخر تمہاری اس تحریر یا تقریر کا انجام کیا ہوگا۔ صرف معینہ وقت کا صرف کرنا مقصود ہے۔ یہ تمہارے لئے تو نہایت آسان ہے۔ مگر میرے عزیز دوستو! ان لوگوں کے لئے نہایت گراں ہے جو اسے پڑھتے یا سنتے ہیں۔

حقیقتہً یہ نقص اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ آپ لٹریچر کو کتابوں کے دو بڑے درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کے اعلیٰ درجے میں وہ کتابیں شامل ہیں جو ایسے لوگوں نے لکھی ہیں جنہیں کچھ کہنا تھا اپنی زندگی میں انہوں نے وہ وہ باتیں سیکھیں اور دیکھیں جن کو وہ اور لوگوں کو بتانا چاہتے تھے۔ اور جس کی ضرورت بھی تھی وہ کہہ گزرے اور ان کی تصنیفات دنیا کے مطبوعہ لٹریچر کا شاید بیسواں حصہ ہوں تو ہوں صرف یہی حصہ ایسا ہے جس میں وہ باتیں ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ باقی ۱۹ بیسویں حصوں میں دوسرے درجے کی کتابیں ہیں۔

تقریر و تحریر کا ڈھنگ جاننے کے لئے ہمارا پہلا اصول یہ ہے "جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو پہلے خود اُسے خوب سمجھ لو" دوسرا اصول یہ ہے "اسے کہہ ڈالو" یعنی اپنے مضمون کو

کسی اور چیز سے شروع نہ کرو۔ جسے تم خیال کرتے ہو کہ ہم اس کی مدد سے اصل مضمون پر پہنچ جائیں گے؛

تیسرے اور ہمیشہ "اپنی ہی زبان استعمال کرو"۔ یعنی وہ زبان جسے روزمرہ استعمال کرنے کے تم عادی ہو۔ اگر تمہاری روزمرہ کی زبان کسی خط کے یا چھپنے کے لایق نہیں۔ تو وہ بولنے کے بھی قابل نہیں ہے۔ اور اگر اسکول میں یا گھر پہ ہمیشہ ہنسی دل لگی کرنے کی وجہ سے تم گنواری زبان استعمال کرنے کے عادی ہو گئے ہو تو پھر جتنا جلد اسے چھوڑ دو اتنا ہی اچھا ہے؛

"لمبے لفظ سے چھوٹا اچھا ہے"۔ میں ان الفاظ کا ضرور ذکر کروں گا۔ جو میرے ایک مشہور دوست نے ایک اہم عہدہ قبول کرنے کے وقت استعمال کئے تھے وہ لکھتے ہیں

"میں نہیں سمجھتا کہ میں اس عہدے کے لایق ہوں۔ مگر میرے دوست کہتے ہیں کہ میں ضرور ہوں! اور میں ان کا یقین کرتا ہوں۔ میں اسے منظور کرتا ہوں۔ اور جب اس پر پہنچ جاؤں گا۔ تو جہاں تک ہو سکے گا اسے اچھی طرح انجام دوں گا؛"

یہ نہایت اعلیٰ درجے کی تقریر ہے۔ غور کرو۔ کہ اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو چھوٹے سے چھوٹا نہ ہو۔ ہر لفظ عام فہم ہے۔ کوئی بھی غیر مانوس نہیں۔ حالانکہ یہ ایک فاضل شخص ہے اور اگر چاہتا تو اسے بالکل دوسری زبان میں ادا کر سکتا تھا۔ مگر یہ خود اس کی اور اس کے مخاطب کی مادری زبان تھی۔ اور اس لئے وہ اسی زبان کو کام میں لایا جس پر دونوں پیدا ہوئے تھے ؎ ظفر

ہر بات میں تو ایک بھی ہے لاکھ پہ بھاری
گر بات کو اپنی نہ کرے طول سے ہلکا

اردوئے معلےٰ بابت نومبر ۱۹۰۹ء

۱۱

چیچک

مرض چیچک کی عمر ساڑھے تیرہ سو برس ہے۔ فخر الدینؒ کی رائے ہے۔ کہ حکیم جالینوس اس مرض سے واقف تھا۔ لیکن یہ امامؒ کا وہم ہی وہم ہے۔ ورنہ تحقیق حق یہ ہے کہ وسط چھٹی صدی عیسوی تک اطبا اس مرض سے آگاہ نہ تھے۔ اس زمانہ کے بعض مورخوں کی تصنیفات میں چیچک کے عرب۔ مصر اور جنوبی یورپ میں بصورت وبا نمودار ہونے کا ذکر آتا ہے۔ چند مفسر اس طرف گئے ہیں کہ اصحاب فیل (سنہ ۵۷۰ء) پر جو بلا نازل ہوئی وہ بھی دراصل چیچک ہی کی شکل میں تھی۔

ایک یونانی مورخ نے لکھا اور بجا لکھا ہے کہ پہلے پہل یہ بیماری ملک مصر میں سنہ ۵۴۴ء میں پیدا ہوئی۔ پچیس برس بعد سنہ ۵۶۹ء میں مصر سے قسطنطنیہ پہونچی۔ اس کے بعد ایشیا میں قدم بڑھایا۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے۔ کہ ایشیا میں یہ مرض قدیم زمانہ سے تھا۔ یورپ میں ایشیا سے پہونچا۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یورپ میں اس کا بڑا چرچا تھا۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ یورپ سے جو مسیحی مجاہد ایشیا میں آتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اس مرض کو لے جاتے تھے۔ امریکہ کی دریافت کے بعد ہی یہ مرض یورپ سے وہاں بھی پہنچ گیا۔ ایک زمانہ میں یہ نفرت انگیز اور مہلک مرض اس قدر عام تھا کہ جب کبھی سر اٹھاتا تو گاؤں کے گاؤں صاف کر دیتا تھا۔ اس دشمن نوع انسان نے چوتھائی اولاد آدمؑ کو اندھا اور کریہ المنظر کر دیا۔ چیچک کی برابر تباہی پھیلانے کا بہت کم امراض دعوے کر سکتے ہیں (گو آج کل طاعون اس میدان میں بڑھا ہوا نظر آتا ہے) اوائل دس صدی عیسوی تک اطبا اس مرض کی تشخیص اور علاج پر پورے طور سے قادر نہ تھے۔ ڈاکٹر جینر کے ٹیکہ کی ایجاد سے پہلے یورپ میں چیچک کا علاج اس طرح سے ہوتا تھا کہ چیچک کے مریض کے جسم سے مادہ لے کر تندرست کی جلد میں داخل کر دیتے تھے۔ اس طریقہ علاج کو "انا کولیشن" کہتے ہیں۔ چیچک کا انا کولیشن مشرقی قوموں میں عرصہ دراز سے مروج تھا۔ ۱۸ ویں صدی میں ٹرکی سے انگلستان پہونچا۔ اور پھر انگلستان سے یورپ کے دوسرے ممالک میں جاری ہوا۔ چونکہ یہ علاج بالمثل ہے۔ اس

لیے اناکولیشن شدہ شخص پر چیچک کا حملہ ہونا ضرور تھا لیکن اس سے موت واقع نہیں ہوتی تھی۔ مگر مریض اکثر اوقات بدشکل ہو جاتا تھا۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی تھی کہ اس مریض سے متعدی ہو کر مرض تندرستوں میں بھی پھیل جاتا تھا۔ اس طرح گویا اناکولیشن خواہ مخواہ مرض کے پھیلنے کا باعث ہوتا تھا۔ انھی خرابیوں کی وجہ سے انگلستان کی پارلیمنٹ نے چیچک کے اناکولیشن کو ۱۸۴۰ء کے ایکٹ کی رو سے بالکل ممنوع قرار دیا اب اس کی بجائے ڈاکٹر جینر کا "ویکسینیشن" مروج ہے۔ "ویکا" لاطینی زبان میں گائے کو کہتے ہیں اور اس علاج کو ویکسینیشن اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ گائے کے تھنوں پر ایک قسم کی پھنسی ہوتی ہے۔ اس کا مادہ جسم انسانی میں داخل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جینر کا خیال اس علاج کی طرف محض اتفاقیہ طور پر زمانۂ طالب علمی میں رجوع ہوا تھا۔ ۲۱ سال کے مسلسل غور و فکر کے بعد جینر نے ۱۷۹۸ء میں ستر صفحہ کا ایک رسالہ شایع کر کے اپنی رائے کو مشتہر کیا۔ اس رسالہ میں اُس نے اُن ۲۳ مریضوں کا بھی تفصیلی حال لکھا جن پر اس عرصہ میں اس نے اپنے ٹیکہ کا کامیابی کے ساتھ تجربہ کیا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا غالباً ذرا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ جو قوم آج تہذیب و ترقی میں "ہمچو من دیگرے نیست" کا دعوے کر رہی ہے۔ اسی نے اب سے تقریباً سوا صدی پہلے جینر کے ٹیکہ کی سخت مخالفت کی تھی۔ شمعون اسمائس نے لکھا ہے کہ پادریوں نے فتویٰ دیا تھا کہ ٹیکہ کا لگوانا "شیطانی فعل" ہے۔ مگر بہادر جینر ان تمام مخالفتوں کو روندتا کچلتا ہوا انتہائی استقلال اور لگاتار کوشش کے ساتھ برابر ترقی کرتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ "بنیفکٹر دمین" کا خطاب پایا۔ اُس کے ایجاد کردہ طریقہ کو جو عام مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

ٹیکہ کے خلاف لندن میں اور یورپ کے بعض دوسرے مقامات پر آج کل بھی ایک باضابطہ انجمن قایم ہے۔ جو پمفلٹ شایع کر کے لوگوں کو وقتاً فوقتاً اس کی مفروضہ مضرتوں سے آگاہ کرتی رہتی ہے لیکن میری رائے میں ان انجمنوں کی کارروائی سے سوائے اس کے اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ امر حق سے منہ موڑنے والے ہمیشہ ہی موجود رہتے ہیں کبھی معدوم نہیں ہوتے۔ اگرچہ ٹیکہ سے مرض کا استیصال کلی نہیں ہوا لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اس کا زور عشر عشیر بھی نہیں رہا۔

اس جگہ جو بات میں خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ٹیکہ کی ایجاد نے ڈاکٹر جینز کا نام تمام عالم میں روشن کر دیا۔ لیکن سب سے پہلے دنیا میں جس شخص نے خسرہ اور چیچک کے متعلق لکھا۔ وہ ایک مسلمان حکیم ابوبکر محمد بن زکریاؒ ہے۔ جو رے جیسے مردم خیز مقام میں سنہ ۲۴۱ھ میں پیدا ہوا۔ جب چالیس سال کی عمر میں تحصیل علم کا شوق ہوا۔ تو اس نے علاوہ دیگر علوم کی کامل دستگاہ کے خاص فن طب میں وہ کمال حاصل کیا کہ "امام الصناعۃ" کہلایا۔ اگرچہ

امام الصناعہ ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے خسرہ کا ذکر اپنی متعدد تصنیفوں میں کیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق مستقل طور پر اس نے صرف اسی رسالہ میں بحث کی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اور جس کا نام رسالۃ الجدری والحصبہ ہے [چیچک۔ خسرہ ۱۲]۔ فرانس کے ڈاکٹر اس رسالہ کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اور اس کو معتبر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک عیسائی مصنف علامہ **پطرس** نے لکھا ہے :- ھی رسالۃ نفیسۃ ذات اعتبار عظیم واھمیۃ کثیرۃ عند الافرنج یعنی یہ ایک نفیس رسالہ ہے جو اہل فرانس کے نزدیک بڑا معتبر اور بہت مہتم بالشان ہے یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کا ترجمہ متعدد بار ہوا۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر ڈاکٹر جینر نے ان یونانی یا لاطینی ترجموں سے استفادہ کیا ہو۔ سنہ ۱۷۴۷ء میں ڈاکٹر **گرین ہل** نے اس کا اصل عربی سے ترجمہ انگریزی میں کر کے انگلستان میں بھی شائع کیا۔ یہ رسالہ بیروت میں چھپ چکا ہے۔ یورپ نے ابوبکر محمد بن ذکریا رازی کی اور تصنیفوں سے بھی کچھ کم اعتنا نہیں کیا چنانچہ وہی عیسائی مصنف کہتا ہے۔ کَانَتْ کُتُبُہٗ مُدَّۃً طَوِیْلَۃً تُعْتَبَرُ رُکْنًا فِیْ اُوْرَبَا یعنی یورپ میں اس کی کتابیں مدت دراز تک ایک رکن خیال کی جاتی رہی ہیں۔ آخر عمر میں یہ حکیم نابینا ہو گیا تھا۔ سنہ ۳۱۱ھ میں رہ گرائے عالم بقا ہوا۔

چیچک دنیا کی متعدی امراض میں سے ہے۔ مریض کے گرد و پیش کی ہوا اس کے کپڑوں اور آس پاس کے سامان میں بھی مادہ سرایت کر جاتا ہے۔ اس کی چھوت مردہ کے ذریعہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے۔ کہ بچے چیچک میں مبتلا پیدا ہوئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ رحم کے اندر بھی اس کا اثر پہنچ

جاتا ہے۔ سیاہ چہرہ قومیں اس مرض میں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں کسی درجہ اور عمر کے لوگ
اس سے محفوظ نہیں رہتے۔ اکثر ایک حملہ سے زیادہ نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو
بہت خفیف بعض قوموں اور ملکوں میں یہ مرض شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

غالباً میرا مضمون غیر مکمل رہے گا اگر میں اسے بغیر یہ کہے ختم کر دوں۔ کہ ہمارے ملک
میں چیچک کے متعلق بہت غفلت اور لاپروائی سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض
لوگ "ماتا جی" کے تقدس سے مرعوب ہو کر اس کا علاج ہی نہیں کرتے۔ ٹیکہ حالتِ
شیر خوارگی اور پھر اس کے بعد جوانی میں لگوانا چاہیئے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً اس کی تجدید
ہوتی رہے تو بہتر ہے۔ چیچک کے ہسپتالوں میں جو لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کے کثرت
سے ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ ٹیکہ کے متعلق ایک مقام کے اعداد مظہر ہیں۔ کہ وبا کے ایام
میں ۱۰۵۰۴ آدمیوں کے ٹیکہ لگایا گیا تھا جن میں سے صرف دس مبتلا ہوئے لیکن
مرا ایک بھی نہیں بعض یورپین ممالک میں والدین بچہ کی پیدائش کی ایک خاص
مدت بعد ٹیکہ لگوانے پر مجبور ہیں بعض وقت لمف کے ناقص ہونے یا آبلوں کی مناسب
حفاظت نہ کرنے کی وجہ سے ٹیکہ اپنا اثر کماحقہ نہیں کرتا جس سے عوام کو خواہ مخواہ
بدظنی کا موقع ملتا ہے۔ حتی الامکان صفائی کا کافی لحاظ رکھنا چاہیئے کیونکہ ڈاکٹر
لوگ کہتے ہیں کہ اس کا سبب اول عدم صفائی ہی ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اس کو
"غلاظت کا مرض" کہا گیا ہے۔ مریض کی تیمارداری ایسے اشخاص کو کرنی چاہیئے جو
چیچک میں مبتلا ہو چکے ہوں۔ مکان ایسا ہو جس میں تازہ ہوا بخوبی آتی ہو غیر
تیمارداروں کو مکان فوراً چھوڑ دینا چاہیئے۔ مریض کے بستر اور کپڑے جلا دینے
چاہئیں۔ یا گندھک کی دھونی دے کر خوب دھونے چاہئیں۔ اس سے مرض کی شدت
بہت کم ہو سکتی ہے ع خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے ۔ (مجلۂ طبیہ بابت جنوری و فروری
۱۹۰۵ء)

۱۳[ا] خیالات کی حفاظت

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بُرے اور ناپاک خیالات کو دل میں جگہ دینا کوئی عیب کی بات نہیں۔ کیونکہ جب تک خیالات عملی صورت اختیار نہ کریں اُن سے اپنی یا کسی غیر کی ذات کو نفع یا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی کو دل میں بُرا سمجھیں لیکن اپنے اقوال یا افعال کے ذریعہ سے ایسا ثابت نہ ہونے دیں۔ تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ پیارے عزیز بچّو! جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں۔ تم ہرگز ان کے ہم خیال نہ ہونا ہمارے خیالات ہی گویا ہمارا وجود ہیں۔ ہر شخص کے اخلاق کی عمارت کے خاموش معمار یہ خیالات ہی ہیں۔ انسان جیسا دل میں سوچتا ہے ویسا ہی اس سے ظہور میں آتا ہے۔ اقوال و افعال خیالات کا عکس ہیں۔ اس لئے خیالات کی حفاظت ضروری ہے لیکن یہ کام جس قدر ضروری ہے اُسی قدر آسان ہے۔ خیالات تصورات اور جذبات ہمارے دل میں دریا کی طرح جیس مارتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان خیالات اور جذبات میں جو بُرے ہوں۔ اُن کو اپنے دل سے نکال دیں۔ دل میں خیالات کو جگہ دئے بغیر ناممکن ہے کہ کوئی شخص زندہ رہ سکے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ ہم بُرے خیالات کو اپنے دل میں نہ آنے دیں لیکن یہ بالکل ممکن اور آسان ہے کہ بُرے اور گندے خیالات کو ہم دل کی کوٹھڑی کے دروازہ سے ہی لوٹا دیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ راستہ میں چلتے چلتے ہماری نگاہ کسی ایسی چیز پر پڑ جاتی ہے جس سے دل میں ناپاک خیالات پیدا

[ا] مضامین کے نمبروں میں ۱۱ کے بعد ۱۳ دیکھکر شاید ناظرین مشوش ہونگے اس لئے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۱۱ کے بعد اور نمبر ۱۳ سے پہلے جو مضمون لکھا گیا تھا وہ اُسی زمانہ کی دلچسپی کا تھا جس زمانہ میں وہ لکھا گیا تھا۔ لہذا اس موقع پر اسے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے آگے جو مضمون آتا ہے اس پر نمبر ۱۲ درج ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ بیچ کے مضامین چھوڑ دئیے گئے ہیں۔ میں شروع ہی میں یہ گزارش کر چکا ہوں۔ کہ جو مضامین دائمی دلچسپی کے نہیں ہیں۔ ان کو نیز نظموں کو اس مجموعہ سے خارج کر دیا گیا ہے ۱۲۹۷

ہوتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ جب کبھی ہماری آنکھ کسی ایسی چیز پڑے تو اس کو فوراً
اس چیز سے ہٹالیں۔ اور اُس سے جو بُرے خیالات دل میں پیدا ہوئے ہوں
ان کو بھلادیں۔ اگر تمہارا کوئی ساتھی تم کو کوئی ایسی چیز دکھائے۔ جس سے خیالات
پر بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہو۔ تو اس کو ہرگز نہ دیکھو۔ بلکہ اپنے ساتھی کو سمجھادو۔ کہ
کبھی آئندہ ایسی ناشائستہ حرکت کرنے کی جرأت نہ کرے۔ صرف اچھے خیالات
کو دل میں جاگزین رکھنے سے بُرے خیالات خودبخود دور رہیں گے۔ چنانچہ ایک
بہت بڑے عالم کی بھی یہی رائے ہے اس کی مثال اُس نے یہ دی ہے۔ کہ
خاردار اور ناکارہ درختوں کو باغبان باغ سے علیحدہ رکھنے کے لئے ہمیشہ یہ کرتا ہے
کہ کوئی جگہ عمدہ اور خوشبودار درختوں سے خالی نہیں چھوڑتا۔ جس گھر کے رہنے والے
بُرے ہوتے ہیں۔ وہ گھر ہمیشہ پڑوسیوں کے لئے پرخطر ہوتا ہے۔ اس لئے چھوٹے بچو!
اگر تم اپنی اس دُنیا کی زندگی کو خوشگوار بنانا اور آخرت میں اعلےٰ درجہ حاصل کرنا
چاہتے ہو تو اپنے ننھے دلوں کو بُرے خیالات کی آلودگی سے پاک صاف رکھو اور
ہمیشہ خدا کے فضل کے امیدوار رہو۔ بچوں کا اخبار بابت مارچ ۱۹۰۵ء

۳۱

عیادت

عیادت عام طور پر عین کے فتحہ سے مشہور ہے۔ مگر اس کی سند کسی لغت سے نہیں
اس کا صحیح تلفظ عین کے کسرہ سے ہے۔

جب کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے سارے قوے
مضمحل اس کے خیالات پریشان اور بعض اوقات حواس مختل ہو جاتے ہیں اُس
کی خوشی خرمی اور آسائش کا دارومدار زیادہ تر غیر دل کے ہاتھوں میں جا پڑتا ہے
اگر مرض طبیعت پر غالب ہو چکا تو مردہ بالکل ہی بدست زندہ ہے۔ اگر تیمارداری
کا سامان کافی مریض کے خاطر خواہ نہیں تو پھر العظمۃ للہ اُس کی مصیبت کا کیا
ٹھکانا ہے۔ زمین و آسمان اُس کی نگاہ میں تاریک ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں

تیمارداروں کا فرض ہے کہ مریض کی آسایش کا ہر طرح حتی الامکان لحاظ رکھیں۔

جب کسی گھر میں کوئی مریض ہوتا ہے تو خاندان میں ایک عام تشویش کی حالت ہوتی ہے۔ اور بہت سے کام محض اس وجہ سے معطل ہو جاتے ہیں۔ کہ مریض کی تیمارداری سے بہت کم مہلت ملتی ہے۔ ایسی عام مصیبت کے وقت میں یہ بات انسانی فرایض میں داخل ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کی جائے۔ مدد کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ روپیہ پیسہ یا ہاتھ پاؤں ہی سے ہو۔ اگر مریض کے پاس بیٹھ کر چند کلمات تشفی آمیز کہدئے تو یہی سب کچھ ہے۔

رسول خدا صلعم نے ایک مسلمان کے دوسرے پر جو حقوق معیّن فرمائے ہیں ان میں عیادت کو دوسرے درجہ پر رکھا ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے

حق المسلم علی المسلم خمسٌ ردّ السلام وعیادة المریض واتباع الجنائز واجابة الدعوة وتشمیت العاطس	مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔ سلام کو لوٹانا۔ بیمار پرسی کرنا۔ جنازہ کے ساتھ چلنا۔ دعوت کو قبول کرنا۔ اور چھینک کا جواب دینا۔

ایک دوسری روایت میں اور حقوق پر اُسے مقدم فرمایا ہے۔

للمومن علی المومن ستّ خصال یعوده اذا مرض ویشهده اذا مات ویجیبه اذا دعاه ویسلم علیه اذا لقیه ویشمّته اذا عطس وینصح له اذا غاب او شهد	مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں اگر بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔ اگر مرجائے تو اس کے گورکفن میں شریک ہو اگر پکارے تو بولے اگر ملاقات ہو تو اس کو سلام کرے اگر چھینکے تو اس کی چھینک کا جواب دے اور حاضر غائب اس کی خیرخواہی کرے۔

اسلام میں جو کافۂ انام کی ہمدردی میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ غیر مسلم کی عیادت کو بھی مستحسن قرار دیا گیا ہے جیساکہ اس حدیث سے ثابت ہے:۔

اطعموا الجائع وعودوا المریض وفکوا العانی	بھوکے کو کھلاؤ۔ بیمار کو پوچھو اور اسیر کو رہا کرو

اس میں غیر مسلم کی قید موجود نہیں ہے اس روایت کی مزید تائید حضرت صلعم کے اس فعل سے ہوتی ہے کہ آپ انسؓ کی روایت کے موافق اپنے ایک یہودی غلام کی عیادت کو

بحالت اُس کے کفر کے تشریف لے گئے تھے؛

عیادت کی تشویق کے واسطے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے

ان المسلم اذا عاد اخاہ المسلم لم یزل فی غرفتہ الجنۃ حتی یرجع ۔

جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو لوٹنے تک برابر جنت کی کھڑکی میں رہتا ہے

یہاں لفظ مسلم سے جو شک پیدا ہوتا ہے ضرور ہے کہ اُس کے رفع کرنے کے لئے ایک حدیث اور نقل کی جائے جو مسلم کی قید سے خالی ہے ۔

من عاد مریضا نادی منادٍ من السماء طبت وَتاب ممشاك و تبوعت من الجنـــــــــة مـــــــنزلا

جب کوئی شخص بیمار کے پاس جاتا ہے تو آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے تو خوش رہے اور تیرا چلنا خوشی کا چلنا ہو اور تو بہشت میں جگہ پائے ۔

غرضکہ مریض کی عیادت اور اس کے ساتھ ہمدردی اشرف ترین خصائص و لوازم انسانی میں سے ہے مگر آج کل اس رسم کے متعلق خالص اسلامی ہدایتوں کو چھوڑ کر افراط تفریط کو بہت کچھ دخل دے دیا گیا ہے ۔ جس سے سوائے نقصان کے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہوتا خود مریض سے یا اسی کے سامنے مرض کی اُدھیڑ بن کی جاتی ہے ترقی ضعف اور سختی مرض پر اظہار تاسف کیا جاتا ہے معالج خواہ کیسا ہی حاذق اور مزاج دان ہو اس کی برائی کی جاتی ہے اگر خدا نے جی میں کچھ رحم ڈالا تو کسی اور حکیم ڈاکٹر بتا دیا ورنہ اپنی طرف سے کسی فقیر یا سادھو کا دیا ہوا اپنا مجرب چٹکلہ پیش کیا جاتا ہے ۔ سارے پولیٹکل مباحثے عدالت کے جھگڑے مریض کی پٹی ہی سے طے کیا جاتے ہیں ۔ اور اس بات کا کچھ خیال نہیں ہوتا کہ ہماری باتوں سے مریض کو بھی دلچسپی ہے یا نہیں ۔ مریض کے مکان سے بغیر ایک دو وقت ٹھیرے لوٹ جانا سخت معیوب خیال کیا جاتا ہے ۔ بعض اوقات عیادت کرنے والوں کا اتنا ازدحام ہو جاتا ہے کہ مہمان داری کی مصروفیت کی وجہ سے تیمار داری میں فرق آنے لگتا ہے اور جو مفت کی مالی زیر باری ہو جاتی ہے ۔ وہ اس کے علاوہ ہے ۔ اب اس امر کا فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ رسم عیادت کا یہ طریقہ کس قدر مذموم اور اصلاح طلب ہے ۔ کیا لازم ہے جب کسی کی عیادت کو جائیں تو کوئی بات ایسی نہ کریں جو رنج

مریض کے لئے باعث تکلیف ہو۔ بلکہ ہر طرح اس کی تشفی اور دل جوئی کرنی چاہئے۔ حضرت صلعم کا ارشاد ہے

اذا دخلتم علی المریض فنفسوا لہ فی اجلہ فان ذلک لا یرد شیئا و یطیب بنفسہ	جب تم بیمار کے پاس جاؤ تو اسکے دل سے موت کا غم دور کرو اس سے اس کی آئی ہوئی کچھ ٹل نہیں جاتی البتہ اس کا جی خوش ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص تپ میں مبتلا ہوا۔ آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور فرمایا

لا باس علیک طھور۔ انشاء اللہ تعالےٰ	کچھ ڈر نہیں خدا نے چاہا تو یہ تپ تمہیں گناہوں کی آلایش سے پاک کر دیگی

مرض خواہ کیسا ہی سخت اور مریض کی حالت کیسی ہی نازک ہو اس کو مریض پر ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔ بخلاف اس کے ہر طرح شفا کی امید بندھانا اور تشویش کو کم کرنا چاہئے۔ اگر فن طب میں کچھ دخل ہو۔ تو اپنی رائے کے موافق معالج کو مناسب مشورہ دینا چاہئے۔ یہ نہیں کہ قیاس اور تجربہ کی بنا پر بلا اتفاق معالج غذا یا دوا تجویز کر دی اگر بدنصیبی سے کوئی معالج موجود نہ ہو تو بھی بغیر پوری واقفیت کے علاج کے بارہ میں رائے زنی نہیں کرنی چاہئے۔ جتنی دیر بیٹھیں ہاتھ سے زبان سے غرض جس طرح بن پڑے مریض کو راحت پہنچائیں۔ طولانی نشست سے بھی احتراز واجب ہے چنانچہ حضرت فرماتے ہیں

افضل العیادۃ سرعۃ القیام	سب سے اچھی بیمار پرسی یہ ہے کہ جلد اٹھ کھڑے ہوں

عیادت کرکے حتی الامکان فوراً لوٹنے کی کوشش کرنا چاہئے عیادت کا عود (بمعنی بازگشتن) کے ساتھ ہم مادہ ہونا اس امر کی جانب ایک لطیف اشارہ ہو سکتا ہے کہ بیمار پرسی کرکے اُلٹے پاؤں پھرنا ضرور ہے۔ اگر ایسا کرنے سے بیمار یا اس کے گھر والوں کو دل شکنی ہوتی ہو۔ تو ٹھیر جانے میں چنداں مضایقہ نہیں۔ اگر مریض تم سے اپنے اطمینان سے اٹھ جانے کو کہے۔ تو بلا کسی قسم کی ناگواری کے اٹھ آؤ کیونکہ بعض مریض سکون اس میں اور تنہائی پسند ہوتے ہیں اور کبھی حالت مرض کا بھی یہی اقتضا ہوتا ہے۔ یا اس سے ہوتی ہوگی کہ خاص خاص لوگوں کے سوا کسی کا اپنے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔

قطع نظر عیادت کے یورپ کا معمولی طریقہ ملاقات بھی نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے مصنف کشف المخبا عن فنون اوربا انگریزوں کے عادات کے بیان میں تحریر کرتا ہے:-

ومن ذالک حسن الترتیب والتدبیر
فی الاشغال والمصالح والتوقیت العمل
فلکل شیٔ عندھم وقت ولکل وقت
شغل فاذا اتفق ان زارھم احدٌ فی ساعۃ
الشغل لم یتحاشوا ان یقولوا المثلا قد
آنسبلک ولکن علینا قضاء ملا بدّ
من المصالح فلا تواخذنا وزرنا فی یوم
کذا - فینصرف عنھم عاذرًا لاعاذلًا
لانہ ھو ایضًا یعاملھم بمثل ذالک
اما عندنا فربما تعطلت مصالح
الانسان بکثرۃ زوّارہ حتٰی یضطرّ
اخیرًا
الٰی
ان یحمد
وسادتہ ویقول شفی اللہ مریضکم

اور انھی (عادات) میں سے کاروبار ومعاملات میں حسن ترتیب حسن تدبیر اور کام کے لئے وقت مقرر کرنا ہے۔ ان کے ہاں ہر بات کا وقت اور ہر وقت کا کام معین ہے۔ چنانچہ ایسا اتفاق ہو جائے کہ کوئی ملاقاتی کام کے وقت چلا آئے تو اس سے بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری سے ہمیں خوشی ہوئی لیکن ہمیں بہت سے ضروری کام کرنے ہیں اس وقت معاف کیجئے اور فلاں روز ہم سے ملئے۔ یہ سنکر وہ ملاقاتی عذر نہ ملامت کرتا ہوا ان کے پاس سے لوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی دوسروں سے یہی برتاؤ کرتا ہے مگر ہمارے ہاں ملاقاتیوں کی کثرت سے بسا اوقات انسان کے کام کاج معطل ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ پریشان ہو کر تنبہ صنا بور یا سنبھالتا اور کہتا ہے خدا تمہارے مریض کو شفا دے۔

کوئی ایسی چیز مریض کے سامنے نہیں لے جانا چاہئے جو اُس کے مرض کے مناسب نہ ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس چیز کی طرف مریض کی طبیعت رغبت کرے اور انکار کئے جانے پر اس کے دل کو صدمہ پہونچے۔ ایسی صورت میں اکثر طوالت مرض اور بعض اوقات مرجانے کا اندیشہ ہے۔ مریض اپنے پاس زیادہ جماؤ دیکھ کر اپنی حالت کو مایوسانہ تصور کرنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوا کے خراب ہونے کا بھی احتمال ہے۔ جب معالج کو مریض سے اُس کے استفسار حال کی ضرورت پڑے تو اُسے مریض کے پاس تنہا چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ مریض حالت مرض کو من وعن بیان کرنے میں حجاب کرے۔ اور ہر امر

کی علانیہ تشریح کرنا چاہتا ہے بھی خلاف تہذیب۔ حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ فرماتے ہیں: "ریشے درون جامہ داشتم و شیخ رحمۃ اللہ علیہ (شیخ شہاب الدین سہروردی یا شیخ شمس الدین ابوالفرج بن جوزی) ہر روز پرسیدے کہ چوں ست و نہ پرسیدی کہ کجا ست۔ دانستم کہ ازاں احتراز میکند کہ ذکر ہر عضو روا نباشد" مریض کے پاس رونی صورت بنا کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔ جس سے اس پر یاس کا عالم طاری ہو جائے نہ اتنا ہنس مکھ بنے کہ وہ سمجھے میری تکلیف کی پروا نہیں ؎

اگرچہ اسی موضوع پر اور چند اصحاب بھی اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار فرما چکے ہیں مگر کسی رسم کی اصلاح بغیر مسلسل کوشش کے ممکن نہیں۔ اس لئے یقین ہے کہ مجھ پر ذیل کا شعر صادق نہیں آئے گا ؎

بھلا تردد بیجا سے ان میں کیا حاصل
اُٹھا چکے ہوں زمیندار جن زمینوں کو

۲۵

مردہ زندہ ہوگیا

(عربی سے ترجمہ)

شہر ہال واقع جرمنی میں جانکر نامی ایک عالم تشریح رہا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے پاس دو لاشیں لائی گئیں۔ جن کو کسی جرم میں پھانسی دی گئی تھی تاکہ ان کو چیر کر اپنے شاگردوں کو دکھائے۔ اس وقت جانکر کے پاس درسگاہ کی کنجی نہ تھی۔ اس لئے دونوں لاشیں درس گاہ اور اس کے خواب گاہ کے درمیان ایک جگہ رکھ دی گئیں۔

آدھی رات کے وقت جب اس کے تمام گھر والے سو رہے تو جانکر حسب عادت بیٹھ کر کچھ لکھنے لگا۔ یکایک اس مقام سے جہاں لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے کان میں کچھ آواز آئی۔ اس نے سمجھا۔ کہ شاید گھر کی بلّی یہاں بند ہوگئی ہے اس خیال سے جانکر شمع ہاتھ میں لے کر اُٹھا دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ جس گون میں لاشیں بند تھیں۔ وہ بیچ سے پھٹی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر جانکر کو بہت تعجب ہوا۔ اور قریب گیا

تو معلوم ہوا کہ ایک مردہ بھی غائب ہے۔ باوجودیکہ مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بند
تھیں۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ وہاں سے مردہ کو لے جائے۔ جانگر گھبرا کر اِدھر اُدھر
ڈھونڈنے لگا۔ دیکھا کہ مردہ ایک طرف کھڑا جانگر کی طرف گھور رہا ہے۔ اب تو جانگر کے
خوف کی انتہا نہ رہی۔ سارے جسم میں رعشہ تھا۔ نہ آگے بڑھتے بنتی تھی۔ نہ اپنی خوابگاہ
کو واپس جا سکتا تھا۔ اور مردہ کی نظر برابر جانگر کی طرف لڑی ہوئی تھی۔ آخر دل کڑا کرکے
الٹا اپنے کمرہ کی طرف چلا۔ ایک ہاتھ میں شمع تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے کمرہ کا دروازہ
ٹٹولتا جاتا تھا۔ جانگر کے ساتھ مردہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کا جسم برہنہ
اور چہرہ زرد تھا۔ یہ دیکھ کر جانگر کے حواس بالکل باختہ ہو گئے۔ شمع ہاتھ سے گر کر بجھ
گئی۔ اور اپنے کمرہ میں جا کر فرش پر گر پڑا۔ پیچھے سے مردہ بھی جا کر اس کے قدموں کو بوسہ
دینے لگا۔ یہ دیکھ کر جانگر کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اب مردہ نے جانگر کو چھوڑ تو دیا
مگر اس کے گہرے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سانسوں کی آواز جانگر کے کان میں آتی رہی
تھوڑی دیر کے بعد مردہ نے بہت ہی دھیمی آواز سے کہا "اے نیک مرد خدا کے لئے
مجھ پر رحم کر" جانگر سمجھا کہ یہ شخص مرا نہیں ہے اس لئے اس کی تسکین ہو گئی۔ اور
کچھ کچھ حواس مجتمع ہوئے اور اس نے گھر کے کسی آدمی کو آواز دی۔ مگر اس مردہ نے
(جو اب زندہ تھا) کہا کہ "خدا کے لئے کسی اور کو اس راز سے آگاہ نہ کرو ورنہ میری جان
جائے گی۔ اور میں مارا جاؤں گا۔ اگر کچھ حق انسانیت سمجھتا ہے۔ تو مجھے رہائی دیجئے"۔
جب جانگر کا پورا پورا اطمینان ہو گیا۔ تو اٹھ کر روشنی لایا۔ اور بدن ڈھکنے کے لئے کچھ
کپڑا دیا۔ اور کوئی مقوی دوا پلائی اور کہا کہ اب اپنی سرگزشت سناؤ۔ اس شخص نے کہا
کہ "میں فوج شاہی میں ملازم تھا۔ جب غنیم نے ہال کا محاصرہ کیا۔ تو میں بھاگ گیا۔ اور
فوجی خدمت انجام نہ دی۔ کچھ عرصہ بعد میں گرفتار ہو گیا۔ اور فوجی قوانین کے بموجب
مجھ کو پھانسی دی گئی"۔ یہ سن کر جانگر کو فکر ہوئی۔ کہ کسی نہ کسی تدبیر سے اس کی جان
بچانی چاہئے اور سوچا کہ اس کو شہر کے پھاٹک سے نکال دینا چاہئے۔ اگر تقدیر نے
مساعدت کی۔ تو کسی غیر ملک کو چلا جائے گا۔ اس لئے جانگر نے کپڑوں کا ایک عمدہ جوڑا
اس کو پہنایا۔ اور طلوع آفتاب سے پہلے اس کو اپنے ساتھ لے کر چلا۔ جانگر تو ایک
مشہور شخص تھا۔ اور چھوٹے بڑے سب اس کو جانتے تھے۔ مگر اس شخص کی نسبت

دربان نے جانکر سے پوچھا۔ کہ یہ کون ہے۔ جانکر نے کہا کہ یہ شخص مجھے ایک مریض کے علاج کے واسطے لئے جاتا ہے۔ یہ سن کر دربان نے ان کو نکل جانے دیا۔ جنگل میں پہنچ کر جانکر نے بقدر حاجت اس کو نقد دیا۔ اور دعا دے کر رخصت کیا۔ اس شخص نے بھی عہد کیا کہ اگر زندہ رہا۔ تو اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔ قصہ مختصر دس بارہ سال کے بعد ڈاکٹر جانکر اسٹرڈم (ہالینڈ) جا نکلا۔ ایک دن وہ ایک تاجر کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص جو صورت اور وضع سے نہایت شریف معلوم ہوتا تھا آکر اس کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اور قریب آکر پوچھا۔ کہ کیا آپ شہر ہال کے معلم تشریح جانکر ہیں۔ اور بصورت اثبات جواب ملنے پر بڑے اصرار سے جانکر کو اپنے گھر لانے اور مہمان ہونے پر آمادہ کیا۔ جب جانکر اس کے مکان پر پہونچا۔ تو دیکھا۔ کہ ہر چیز آرام و آسایش کی مہیا ہے اور ایک حسین بی بی اور دو بچے ہیں۔ سارے خاندان نے جانکر کی بہت خاطر و مدارات کی اور بہت خلق سے پیش آئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میزبان جانکر کو تنہا ایک مکان میں لے گیا۔ اور پوچھا کہ آپ نے مجھ کو پہچانا یا نہیں۔ جانکر نے جواب دیا کہ میں نے آپ کو مطلق نہیں پہچانا۔ اس پر میزبان نے اپنا سارا قصہ سنایا کہ میں وہی سپاہی ہوں جس کو ہال میں پھانسی ہوئی تھی اور جس کی جان آپ نے بچائی تھی۔ آپ سے رخصت ہو کر میں یہاں پہنچا۔ اور ایک تاجر کا ملازم ہو گیا۔ میرا آقا مجھ سے بوجہ میری دیانتداری اور حسن خدمات کے ایسا خوش ہوا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کی مجھ سے شادی کر دی۔ اور تمام مال و اسباب مجھے دے دیا۔ اور اگر آپ کی مہربانی مجھ پر نہ ہوتی۔ تو میں اس درجہ کو ہرگز نہ پہونچتا۔ اب یہ سب کچھ گویا آپ ہی کا ہے اور ہم سب آپ کے غلام ہیں۔ اس قصے نے جانکر پر ایسا اثر کیا۔ کہ وہ تاجر سے لپٹ گیا۔ اور مہمان و میزبان دونو مل کر خوب روئے۔ ان کے رونے کی آواز سن کر تاجر کے بی بی بچے بھی آکر رونے لگے۔ جب تاجر نے اپنی سرگزشت اپنے خاندان کو سنائی تو سب لوگ حیران ہو گئے اور جانکر کی ہمدردی کی تعریف کرنے لگے۔ (انتخاب لاجواب ۲۶۔ اپریل ۱۹۰۹ء)

۲۸

عیّاری

(عربی سے ترجمہ)

ایک صّراف روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی لئے چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں چند عیار لوگ اس کو ملے۔ اور اُنھوں نے بھانپ لیا۔ کہ ضرور اس کے پاس بہت سا مال ونقد ہے۔ اب آپس میں مشورے ہونے لگے کہ روپیہ پر کس طرح ہاتھ مارنا چاہئیے ایک نے کہا اچھا دیکھو میں تھیلی کو اڑاتا ہوں۔ یہ کہکر عیار صراف کے پیچھے ہو لیا گھر میں پہنچ کر صراف نے تھیلی تو ایک طرف رکھ دی اور خود تقضائے حاجت کے لئے بیت الخلا میں گھس گیا۔ اس کے گھر میں ایک لونڈی بھی تھی۔ اس سے کہتا گیا۔ کہ مجھے تو پانی لینے کی فرصت نہیں ہے تو پیچھے سے مجھے لوٹے میں پانی بھر کر دے دینا لونڈی پانی بھر کر صراف کو بیت الخلا میں دینے کے لئے گئی۔ مگر گھر کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا۔ عیار تو ایسے موقع کا منتظر ہی تھا۔ دبے پاؤں گھر میں گھس گیا۔ اور تھیلی لے کر چلتا بنا۔ اور جا کر اپنے ساتھیوں کو سارا ماجرا سنایا۔ سب لوگ اس کی چالاکی کا حال سن کر حیران رہ گئے۔ اور کہا کہ واقعی یہ کام تمہارا ہی تھا۔ ہر شخص سے ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں ہے۔ جب صراف بیت الخلا سے واپس آیا اور تھیلی کو دیکھا کہ غائب ہے۔ تو اس کو کامل یقین ہو گیا۔ کہ یہ لونڈی ہی کا کام ہے۔ کیونکہ گھر میں اس کے سوا دوسرا کوئی تھا نہیں۔ مگر وہ صاف انکار کرتی تھی کہ تھیلی میں نے دیکھی تک نہیں ہرچند صراف نے بازپرس کی مگر بیچاری خادمہ کو خبر تو تھی ہی نہیں۔ بتاتی کہاں سے۔ ادھر اتنا زر کثیر کھو کر صراف کو صبر کس طرح آسکتا تھا۔ اس نے خادمہ پر سخت تشدد کرنا شروع کیا۔ جب یہ خبر عیاروں تک پہنچی تو ان کو سخت افسوس ہوا۔ کہ ہماری وجہ سے ایک بے گناہ کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ کہ جس طرح ممکن ہو ناکردہ گناہ خادمہ کو عذاب سے نجات دلانی چاہئیے۔ اس کام کے لئے وہی عیار مقرر کیا گیا۔ جو تھیلی چرا کر لایا اور اس فساد کا بانی تھا۔ عیار جب صراف کے دروازہ پر پہونچا۔ تو معلوم ہوا کہ خادمہ پر مار پڑ رہی ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر

صراف نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے۔ عیار نے جواب دیا کہ آپ باہر آئیں تو بتاؤں۔
یہ سن کر صراف باہر نکلا۔ عیار نے کہا کہ میں آپ کے فلاں دوست کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔
انھوں نے بعد سلام کے کہا ہے کہ آپ روپیہ پیسہ کا پیشہ رکھتے ہیں۔ مگر فضل الٰہی سے
غافل اور لاپروا اتنے ہیں کہ اپنے ال کی ذرا حفاظت و فکر نہیں ہے۔ یہ تھیلی آپ
دوکان ہی پر رکھی چھوڑ آئے تھے۔ اگر اور کوئی دیکھ پاتا تو کب چھوڑنے والا تھا۔ بغل میں
دبا کر چلتا بنتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کے حواس ٹھکانے نہیں رہے۔" یہ کہکر عیار
نے وہ تھیلی صراف کو دکھائی۔ صراف اپنی گم شدہ تھیلی کو پہچان کر خوشی سے اچھل
پڑا اور کہنے لگا کہ "واقعی مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں تھیلی کو یوں دوکان پر بھول
آیا۔ تمہارے آقا نے بڑی مہربانی کی جو اس کو اٹھا کر بحفاظت تمام میرے پاس بھیج
دیا۔" یہ کہکر تھیلی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر عیار نے کہا کہ جب تک آپ مجھے اس کی
رسید لکھ کر نہ لادیں گے۔ میں ہرگز نہ دوں گا۔ اور میرے مالک کی بھی یہی تاکید ہے
کہ بغیر رسید لئے نہ دینا۔ اب صراف کو اطمینان تو ہو ہی گیا تھا۔ رسید لکھنے کے لئے گھر
کے اندر گیا۔ صراف کا پیٹھ پھیرنا تھا کہ عیار تھیلی لے کر یہ جا وہ جا۔ جب صراف گھر
سے باہر آیا۔ اور اس عیار کو نہ پایا تو سر پیٹ لیا اور چاروں طرف اس کی تلاش میں
دوڑا۔ مگر وہ تو عیار تھا اس کا پتہ کہاں لگتا۔ آخر کار بے چارہ صراف مجبور ہو کر بیٹھ رہا

(انتخاب لاجواب ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء)

۳۱
ذاتی مدد کا حیرت انگیز نتیجہ
(عربی سے ترجمہ)

فرانس کا مشہور فلاسفر ذوفال بہت ہی مفلس اور غریب کسان کا بیٹا تھا۔ پھر
اس پر طرہ یہ کہ اس کے والدین اس کو بچپن ہی چھوڑ کر دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ ماں
باپ کے مرنے کے بعد جب فاقہ کشی ہونے لگی تو ذوفال نے گلہ بانی شروع کی۔ اس
حالت میں بہت دن نہ گزرے تھے کہ اس کے آقا نے کسی خفیف سے قصور پر اس کو
نکال دیا۔ ناچار ذوفال نے ترک وطن کا ارادہ کیا۔ وہ زمانہ سخت سردی کا تھا۔

چنانچہ شدت سردی سے ذوفال کو راستہ میں ایسا بخار چڑھا کہ اس کو تن بدن کا ہوش تک نہ رہا۔ ایک تاجر راستہ میں اُسے بیہوش پڑا دیکھ کر اپنے گھر اُٹھا لایا۔ اور بہت کچھ نگہداشت کی۔ یہاں تک کہ ذوفال کی وہی پہلی قوت عود کر آئی۔ اسی شہر میں ایک بہت بڑا تاجر رہتا اور بھیڑ بکریوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اس تاجر نے ذوفال کو اپنے گلہ کی حفاظت پر مقرر کر دیا۔ ایک دن ذوفال نے کسی طالب علم کے ہاتھ میں کتاب دیکھی جس میں حیوانات کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ تھا تو ناخواندہ محض مگر قرینہ سے سمجھ گیا کہ اس کتاب میں حیوانات کا حال لکھا ہے۔ اب اس کو شوق ہوا کہ جن حیوانات کی کتاب میں تصویریں ہیں۔ ان کا حال بھی میں سنوں۔ طالبعلم سے ہر چند اصرار کیا مگر اس نے ذوفال کی عاجزی و منت پر ذرا توجہ نہ کی۔ آخر مجبور ہو کر کتاب واپس کر دی لیکن اس وقت سے تحصیل علم کی آتش شوق ذوفال کے سینہ میں مشتعل ہو گئی۔ خرابی یہ تھی۔ کہ کوئی اس کو پڑھانے والا نہ تھا۔ طالب علم اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے آخر اس نے یہ تدبیر نکالی کہ گلہ بانی کی جو اجرت ملتی تھی اس کو ایک طالب علم کو دے دیتا اور اس سے کتاب کا سبق پڑھ لیتا تھا۔ مدرسہ کے لڑکے شریر تو ہوتے ہی ہیں۔ جب ذوفال مطالعہ میں مصروف ہوتا تو سب آکر اُس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس کو تنگ کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کو ہمیشہ مخفی مقام کی تلاش رہا کرتی تھی۔ ایک دن ذوفال کسی گرجا کی طرف جا نکلا اور دیکھا کہ یہاں اور مقامات کی طرح آدمیوں کی بالکل کثرت نہیں ہے۔ گرجا کے پادری کا نام فلیان تھا۔ ذوفال فلیان سے ملا اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے پادری فلیان کو گرجا کے لئے ایک خادم کی ضرورت بھی تھی۔ دونوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور ذوفال گرجا میں رہنے لگا۔ کام کاج سے جب فرصت ملتی تو پڑھنے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا کچھ عرصہ بعد گرجا کے کارکنوں نے اپنی طرف سے ذوفال کی جگہ ایک اور خادم بھیج دیا جس سے اس کو اپنی خدمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ذوفال کو اس کا سخت صدمہ ہوا۔ پادری فلیان ایک رحم دل شخص اور ذوفال پر بہت مہربان تھا۔ اس نے اپنے کسی دوست کے نام ذوفال کے لئے سفارشی چٹھی لکھ دی۔ جو دوسرے گرجا کا پادری تھا۔ اس گرجا میں کتابیں بھی بہت جمع تھیں۔ مگر پادریوں کو اتنی اتفا

نہ تھی۔ جو ان کتابوں کو استعمال کرسکتے۔ البتہ انھوں نے ذوفال کو اجازت دے رکھی
تھی کہ تم ان کتابوں کو پڑھا کرو۔ چنانچہ ذوفال فرصت کے وقتوں میں ان کتابوں کا
مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی مقام سمجھ میں نہ آتا تو اس پر نشان کرلیتا۔ اور جب کوئی ایسا
آدمی آنکلتا جو ذی علم ہوتا۔ تو اس مقام کو ذوفال اس سے حل کرلیتا تھا۔ جب ذوفال
کو ان کتابوں پر عبور ہوگیا۔ تو اس کو نئی کتابوں کی ضرورت پڑی۔ مگر جو تنخواہ اُس کو
ملتی تھی وہ کھانے پہننے کو بھی بمشکل کفایت کرتی تھی پھر کتابیں کہاں سے آسکتی
تھیں۔ اس کی ذوفال نے یہ صورت نکالی کہ جنگل سے پرند شکار کرکے ان کے بال
اور گوشت اور کھالیں بازار میں بیچتا۔ اور اس ذریعہ سے جو نقد حاصل ہوتا اس کو نئی
کتابوں پر خرچ کرتا۔ اس کوشش میں اکثر ذوفال کو بڑی بڑی مصیبتوں کا بھی سامنا
ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے درخت پر بلی کی قسم کا ایک جانور دیکھا جس
کی جلد کے بال رنگ برنگ اور نہایت ہی خوب صورت تھے۔ ذوفال نے سوچا
کہ اگر یہ جانور شکار ہو جائے۔ تو اس کی کھال کے معقول دام کھڑے ہو سکیں گے
ذوفال درخت پر چڑھ کر ایک شاخ سے دوسری پر بلی کے پیچھے دوڑا۔ مگر وہ کب
ہاتھ آنے والی تھی آخر وہ درخت سے کود کر ایک پرانے درخت کی جڑ میں گھس
گئی۔ مگر سوراخ زیادہ گہرا نہ تھا۔ ذوفال نے اُس کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ سوراخ سے
نکلنا تھا کہ بلی نے پھر کر ذوفال پر ایسا سخت حملہ کیا کہ ذوفال کے سر کے بال اور کھال
صاف نوچ کر لے گئی۔ مگر ذوفال نے بھی اُسے پکڑ کر درخت کی جڑ پر اس زور سے
پٹکا کہ فوراً دم نکل گیا۔ ذوفال نے اس کی کھال کو فروخت کرکے بہت سی کتابیں
خریدیں۔ ایک روز اسی جنگل میں اس کو سونے کا ایک ڈھیلہ پڑا ہوا ملا۔ مگر چونکہ وہ
حد درجہ کا متدین اور پرہیزگار تھا۔ اُس نے سونے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ بلکہ شہر میں
جاکر عام اعلان کردیا۔ کہ فلاں فلاں مقام پر اس قسم کا سونا پڑا ہوا ہے۔ مالک کو خبر
ہوئی۔ تو وہاں پہونچا اور دیکھا کہ میرا مال بجنسہ موجود ہے اس سے اس کے دل میں
ذوفال کی عزت و محبت اپنا گھر کر گئی۔ اور جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ ذوفال کو تحصیل
علم کا بہت شوق ہے۔ مگر بوجہ افلاس اپنے شوق کو کما حقہ پورا نہیں کرسکتا۔ تو اس
نے ذوفال سے کہدیا۔ کہ جس وقت تم کو ضرورت ہوا کرے مجھ سے بلا تکلف روپیہ

لے جایا کرو۔ اس ذریعہ سے ذوفال کو گونہ فارغ البالی ہوگئی۔ اور پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ مطالعہ کتب میں مصروف ہوگیا۔ ایک روز حسب عادت اسی جنگل میں بیٹھا مطالعہ میں غرق تھا۔ کہ ولیعہد فرانس شکار کھیلتا اس طرف آنکلا۔ اور ایک شخص کو اس ویرانہ میں دیکھ کر چاہا کہ اُس کے حالات کی تفتیش کرے۔ مگر ذوفال مطالعہ میں اتنا غرق تھا کہ اس کو شہزادہ کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ آخر جب شاہزادہ کے ساتھیوں نے ذوفال کو ہوشیار کیا تو اُس نے نظر اُٹھا کر شہزادہ کو دیکھا۔ اور بات چیت کی ذوفال کا یہ حال دیکھ کر شہزادہ اس کو پیرس لے گیا۔ اور وہاں شاہی مدرسہ میں داخل کرادیا جہاں اس نے ذوق علم کا وہ جوش دکھایا کہ سارے اساتذہ اور معاصرین دنگ رہ گئے۔ ذوفال بہت بڑا عالم ہوگیا اور تحصیل علم سے فارغ ہوکر اپنی تصانیف کے ذریعہ سے دنیا کو بہت کچھ فائدہ پہونچایا۔ یہ حکایت ان لوگوں کے لئے اچھی سبق آموز ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ حصول علم بغیر دولت کے ممکن نہیں ہے (انتخاب جداگانہ ۱۹ مئی ۱۹۰۵ء)

۳۲

بالکل سچی فال

اُن ملکوں اور قوموں میں جن کو جنگ مشرق اقصیٰ سے دلچسپی ہے۔ اور خصوصاً روس پر جاپان کی عظیم الشان فتوحات کو مسرت اور اطمینان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غالباً ہندوستان اور ہندوستانی کسی سے اس دلچسپی۔ مسرت اور اطمینان میں پیچھے نہیں ہیں۔ دنیا کے اکثر حصہ کو روس نے اپنی طرز عمل سے مخالف بنالیا ہے ایسی حالت میں اگر روس حق پر بھی ہوتا تو بھی اس کے حق پر ہونے کا احساس دشوار اور اس کے ساتھ ہمدردی مشکوک تھی لیکن اس وقت جب کہ حق روس کے خلاف ہے اس امر کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اُس کے مخالف اس کو کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لڑائی سے لوگوں کو اس قدر تعلق خاطر ہے۔ کہ جاپان کی فتح کو وہ عین اپنی کامیابی سمجھتے اور ایسے خوش ہوتے ہیں۔ گویا انہی کو کچھ مل گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ بعض لوگوں نے بیڑۂ بالٹک کی تباہی پر اپنے دوستوں

"کو دعوت دینے کا وعدہ کیا تھا بعض لوگ اُس لڑائی کے نتیجہ کے واسطے فال دیکھتے ہیں۔ اور اتفاق یہ ہے کہ تمام فالیں نتیجہ کو روس کے خلاف مراد اور جاپان کے موافق بتاتی ہیں۔ میرے ایک دوست نے بیڑہ پالٹک کی تباہی کی خبر آنے سے ایک ہی دو وقت پہلے فال دیکھی تھی۔ اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ روس کا بیڑہ غرق ہوئے بغیر نہ رہیگا۔ سوال یہ تھا کہ آئندہ ہونے والی لڑائی میں فتح کس کے نصیب ہو گی؟ اس کا جواب برجستہ یہ نکلا" جو دونوں میں خوب صورت ہے۔ وہ لڑائی ہار جائے گا ایک کے پشتی بان تو طاقت ور دوست ہیں اور لڑائی نہایت عجیب طور سے ختم ہو گی" اب ناظرین بآسانی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ کہ خوبصورت کون ہے۔ اور طاقت ور دوست کس کے پشتی بان ہیں۔ روس کے مضبوط بیڑہ کا یوں "آناً فاناً" تباہ ہو جانا بھی واقعی کوئی کم عجیب بات نہ تھی۔ اور اگر اختتام سے مراد آخری نتیجہ ہے۔ تو اس کا انتظار کرنا چاہئے۔ اسی زمانہ میں ایک اور صاحب نے بھی فال دیکھی تھی۔ اور ان کو یہ جواب ملا تھا" جو چھوٹا اور موٹا ہے وہ کامیابی حاصل کرے گا" غیب دان حقیقی تو وہی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ فال نامہ کے جوابات بالکل ہی عجیب اور مطابق واقعہ ہیں۔ کم از کم اس سے جنگ مشرق اقصےٰ سے عام دلچسپی کا حال تو بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ (زمانہ پیسہ اخبار، جون ۱۹۰۵ء)

۳۴

گردش افلاک

(عربی سے ترجمہ)

ایک مرتبہ رات کے وقت ایک مفلوک الحال شاعر اپنے مکان میں بیٹھا بحالت پریشانی کچھ فکر کر رہا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ شاعر نے اندر سے دریافت کیا کہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟ آواز آئی کہ میں فلاں امیر کا حاجب ہوں امیر نے آپ کو طلب کیا ہے۔ ابھی میرے ساتھ چلئے۔ شاعر نے کہا کہ شاید تم بھول گئے مجھے نہیں بلایا ہو گا کسی اور کو بلایا ہو گا حاجب نے دریافت کیا کہ آپ کا فلاں نام

ہے نہ ؟ شاعر نے جواب دیا۔ کہ ہاں ہے تو سہی۔ حاجب نے کہا تو پھر بس چلئے۔ آپ ہی کو
بلایا گیا ہے۔ جب شاعر کو اطمینان ہوا۔ تو تیار ہو کر حاجب کے ساتھ ہولیا۔ جب دونوں
امیر کے محل کے دروازہ پر پہنچے تو حاجب شاعر کو دروازہ پر کھڑا کر کے خود اندر چلا گیا
اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر اس کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب شاعر نے محل کے اندر
قدم رکھا تو دیکھا کہ مجلس جمی ہوئی ہے۔ چاروں طرف خوشی کے سامان ہیں۔ مہمان
کثرت سے جمع ہیں۔ ہر شخص کے چہرہ سے خوشی ٹپک رہی ہے۔ شاعر نے سمجھ لیا
کہ ضرور شادی کی محفل ہے۔ جب اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ امیر جس نے اس کو طلب
کیا تھا۔ صدر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور گرد و پیش عزیز و اقارب اور رشتہ دار ہیں شاعر
بھی صفوں کو چیرتا پھاڑتا امیر کے سامنے پہونچا۔ اور نہایت ادب سے جھک کر
سلام کیا۔ امیر نے اس کو پہچان کر بیٹھنے کا حکم دیا۔ شاعر حکم پاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر
کے بعد ایک پہلو کا دروازہ کھلا اور خدام ایک نومولود بچے کو لائے۔ بچے کو امیر کے
سامنے لٹایا گیا۔ اور ہر طرف سے مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ بچہ
کو درازی عمر و ترقی اقبال کی دعائیں دی گئیں اس کے بعد شاعروں کی باری آئی
اور نوبت بہ نوبت تہنیت کے قصائد پڑھے جانے لگے۔ جب قصیدے تمام ہوگئے
تو انعام و خلعت تقسیم ہوئے۔ اور اس شاعر کو بھی بہت کچھ ملا۔ جب مجلس برخاست
ہوئی اور سب اُٹھ کر چلے آئے تو یہ شاعر بھی اُٹھ آیا۔ لیکن تھوڑی ہی دور چلا ہوگا
کہ پیچھے سے خادم دوڑا آیا۔ اور کہا کہ امیر نے آپ کو واپس طلب کیا ہے۔ شاعر لوٹ کر
گیا تو امیر نے کہا کہ تم نے کوئی قصیدہ نہیں سنایا۔ شاعر نے معذرت کی کہ مجھے اس
تقریب کی اطلاع نہ تھی۔ اگر پہلے سے خبر ہو جاتی۔ تو ضرور کچھ نہ کچھ عرض کرتا۔ امیر نے
کہا کہ کچھ مضائقہ نہیں تھوڑا بہت جو ہو سکے سناؤ۔ شاعر نے تھوڑی دیر فکر کی۔ اور
سر اُٹھا کر عرض کیا کہ حضور صرف دو بیتیں اس وقت ذہن میں آئی ہیں۔ امیر نے
کہا اچھا سناؤ۔ شاعر نے وہ دو بیتیں پڑھیں جس سے امیر اس قدر محظوظ ہوا۔ کہ
شاعر کو انعام کی ایک کثیر رقم دی۔ اور اس کو ہمیشہ کے لئے فارغ البال کر دیا۔ اس فیاضی
سے شاعر کا کاروبار خوب چلنے لگا۔ اور وہ نہایت متمول لوگوں میں شمار ہونے لگا
لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد امیر کا زمانہ کچھ ایسا برا آیا کہ وہ مال و دولت

جاہ و حشم سب برباد اور سارا خاندان تہ و بالا ہوگیا۔ ایک دن شاعر جو اب بہت بڑا دولت مند تھا۔ حمام میں غسل کرنے کے لئے گیا۔ اس کی مالش کے لئے ایک لڑکا آیا جو نہایت حسین تھا۔ اس وقت اتفاقیہ شاعر کو اُس امیر کا خیال آگیا۔ اور یہ سوچ کر کہ میرا سارا عروج اُسی کی بدولت ہے۔ اس نے وہ دو بیتیں پڑھیں۔ جن کے وسیلہ سے اُس کو اس قدر تمول حاصل ہوا تھا۔ بیتوں کو سن کر اس لڑکے کی عجیب حالت ہوئی۔ چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ شاعر نے سمجھا کہ یہ مجنوں ہے۔ غرض جب نہا دھو کر فارغ ہوا۔ تو حمامی کو بلایا۔ اور بے حد خفگی کا اظہار کر کے اس سے کہا کہ تم نے میری مالش کے لئے دیوانہ لڑکے کو بھیج دیا تھا۔ حمامی کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا۔ اور اُس نے کہا کہ اُس لڑکے سے کبھی ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی جس سے اُس کو دیوانہ سمجھا جا سکے۔ شاعر نے اپنی چشم دید کل کیفیت بیان کی۔ حمامی نے لڑکے کو شاعر کے سامنے بلایا۔ جس نے اس سے استفسار حال کیا۔ لڑکے نے پوچھا کہ آپ نے فلاں بیتیں جو پڑھی تھیں آپ کو معلوم ہے۔ ان کا کہنے والا کون ہے۔ اور وہ کس کی نسبت کہی گئی ہیں۔ شاعر نے جواب دیا۔ کہ اُن کا کہنے والا میں ہی ہوں۔ اور وہ فلاں امیر زادہ کی نسبت کہی گئی ہیں۔ لڑکے نے کہا وہ امیر زادہ میں ہوں۔ اور یہ کہکر بہت رویا۔ اور اَور لوگ بھی جو وہاں اس وقت موجود تھے۔ بے اختیار رو پڑے۔ شاعر نے کہا کہ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں۔ اور تمہارے باپ کی دی ہوئی میرے پاس بہت سی دولت ہے۔ بہتر ہے کہ تم میرے پاس رہو۔ اور اس دولت کو کام میں لاؤ۔ لیکن لڑکے نے کہا میری حمیت تقاضا نہیں کرتی کہ میرے باپ نے جو دیا تھا۔ اُس کو لے لوں غرضکہ شاعر کے بے حد اصرار پر بھی لڑکے نے اس کی درخواست کو کسی طرح منظور نہ کیا۔ یہ برامکہ کے عہد کی سچی اور انقلاب زمانہ کی عبرت انگیز کہانی ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار** (انتخاب لاجواب ۸ جون ۱۹۰۵ء)

۳۴

جانوروں کی قوّت ادراک

جس عنوان پر میں اس وقت کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ ایسا مسئلہ ہے جس کی نسبت قدیم فلسفیوں میں سخت اختلاف ہے لیکن سائنس کی موجودہ ترقی نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ جانوروں میں قوت احساس و ادراک اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات جانور اپنی قوت مدرکہ کا ایسا ثبوت دیتے ہیں۔ جو انسان کی صدہا سال کی دماغی محنت کے نتیجہ کو پس پشت ڈال دیتے اور انسانی عقل کو دنگ کر دینے والا ہوتا ہے۔ مثلاً بعض جانور ایسے ہیں۔ جو زلزلہ کی آمد کا بہت عرصہ پہلے سے پتہ لگا لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت انسان کو اب تک یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ اس کا حال ایک لمحہ پیشتر بھی معلوم کر سکیں۔

میرے موضع مسکونہ سے کچھ فاصلہ پر ایک زمیندار کو چند بدمعاشوں نے قتل کر ڈالا۔ رات کے وقت جب یہ لوگ مقتول کے مکان پر پہنچے۔ تو اس کی ایک گائے اور ایک گھوڑے نے سخت شور و غل مچانا اور اچھلنا کودنا شروع کیا حالانکہ حملہ آور گروہ کچھ اتنا زیادہ نہ تھا جس سے خیال ہو سکے کہ جانوروں کو وحشت ہوئی ہوگی۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان وفادار جانوروں نے ان لوگوں کے فاسد ارادہ کو معلوم کر لیا اور اس لئے اپنے مالک کو ہوشیار کرنے یا اس کو بچانے کی کوشش کی۔ کتوں کا اپنے ہم جنس کی گرفتاری پر واویلا کرنا ان کی بہت بڑی قوت ادراک کی دلیل ہے۔ جو قصہ میں نے اوپر لکھا ہے اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جانور انسان کے ارادہ کا احساس کر لیتے ہیں ؁

مشہور انگریزی شاعر کاؤپر (۱۷۳۱ء تا ۱۸۰۰ء) نے لکھا ہے کہ ایک روز شام کو میں سیر کرنے کے لئے باہر نکل گیا۔ میرا کتا ساتھ تھا۔ واپسی کے وقت میں نے دریا میں سے بنفشہ کا پھول نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ میرا کتا میری خواہش کو تاڑ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ تھا۔ تھوڑی دور ہی چلا ہوں گا کہ اس نے اپنا

پھول لاکر میرے سامنے ڈال دیا۔

ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ کتے نے آقا کی بات کو انسان کی طرح سمجھ کر اس کی تعمیل کی ہے۔ میرے والد نے ایک بار ٹیریر قسم کا ایک کتا خریدا تھا۔ مگر وہ کئی مرتبہ اپنے پہلے مالک کے پاس بھاگ بھاگ گیا۔ آخر کار اس کا مالک کتے کو اپنے ساتھ لاکر اس کو چھوڑ گیا اور کہہ گیا۔ کہ "میں نے تجھ کو بیچ دیا ہے۔ خبردار اب نہ بھاگنا"۔ اس کے بعد پھر اس نے بھاگنے کا نام نہیں لیا۔

ایک محقق نے لکھا ہے کہ جانوروں میں انسان کی باتیں سننے کا سب سے زیادہ مشتاق گھوڑا ہوتا ہے۔

ابوبکر بن خاضبہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ کہ ایک چوہا اپنے سوراخ سے نکلا۔ اور اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور چوہا نکلا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنے اور اُچھلنے کودنے لگے۔ اتفاقیہ ان میں سے ایک چوہا میرے بالکل قریب آگیا۔ اس وقت میرے پاس ایک برتن رکھا ہوا تھا جس کو میں نے جلدی سے چوہے پر اوندھا دیا۔ یہ دیکھ کر دوسرا چوہا بھی میرے قریب آیا۔ اور برتن کے چاروں طرف پھرنے لگا۔ اور برتن کو اُٹھا کر اپنے ساتھی کو چھوڑانے کی کوشش کی۔ جب اس میں اس کو کامیابی نہ ہوئی تو اپنے سوراخ میں جاکر ایک دینار لایا۔ اور میرے سامنے رکھ دیا۔ اور کچھ دیر منتظر رہا یہ دیکھ کر میں نے گردن نیچی کر لی۔ اور بالکل انجان بن گیا۔ اس کے بعد چوہا پھر سوراخ میں گیا۔ اور ایک دینار اور نکال لایا۔ مگر میں نے پھر بھی کچھ خیال نہ کیا۔ جب اس طرح چار پانچ بار کی کوشش میں اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ تو آخر ایک بار جاکر ایک تھیلی ہی نکال کر میرے سامنے ڈال دی۔ جو دیناروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا۔ کہ یہی اس کی ساری پونجی تھی۔ اور اس کے ساتھی کو چھوڑ دیا۔ دونوں اُچھلتے کودتے اپنے سوراخ کے اندر چلے گئے۔ ابوبکر بن خاضبہ کہتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں میں بہت ہی تنگ دست تھا۔ مگر اس غیر متوقع ذریعہ سے بالکل فارغ البال ہو گیا۔

حضرت حسن بصریؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک بکری کو ذبح کرنے کی نیت سے لٹایا۔ اتنے میں ابو ایوب سجستانی آگئے۔ میں چھری

رکھ کر ان سے باہیں کرنے لگا۔ اتنے میں ایک بکری کا بچہ بھی وہاں آ کھڑا ہوئی ہم دونوں نے دیکھا کہ بکری چھری کو اُٹھا کر کچھ دور لے گئی۔ اور گڑھا کھود کر چھری کو اس میں دبا دیا۔ اس سے ہم دونوں کو سخت تعجب ہوا۔ حسن بصریؒ لکھتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عہد واثق کر لیا۔ کہ اب کسی جانور کو ذبح نہ کروں گا۔

ملک سوئٹزر لینڈ (یورپ) کے حالات میں لکھا ہے کہ موسم سرما کے اختتام کے بعد جب لوگ اپنے مویشیوں کو کوہستانی چراگاہوں میں لے جاتے ہیں۔ تو ان کے وہاں پہنچنے کے اول روز ایک عجیب تماشا ہوتا ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے گردو نواح کے کثیر التعداد لوگ جمع ہوتے ہیں۔ گایوں کے ہر گلہ کی ایک گائے سب کی افسر اور ملکہ سمجھی جاتی ہے۔ اور امتیاز کے لئے اس کے گلے میں ایک بہت بڑی گھنٹی بندھی رہتی ہے۔ اس عہدہ کا فیصلہ اس طرح ہوتا ہے کہ گائیں چراگاہ میں قدم رکھتے ہی باہم لڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ جو گائے آخر میں سب پر غالب آتی ہے۔ وہی ملکہ بنتی ہے۔ اور اس کے گلے میں گھنٹی باندھی جاتی ہے۔ جس کو وہ اکثر گردن ہلا ہلا کر فخریہ بجاتی ہے۔ اگر کسی گائے کے پاس یہ عہدہ متواتر چند سال رہنے کے بعد اس سے چھینا جائے۔ تو گائے کو اس کا اس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کھانا پینا تک چھوڑ دیتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ جو سانپ زیادہ زہریلے ہوتے ہیں۔ وہ حملہ آور ہونے میں بھی بہت دلیر ہوتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ان کو اپنی قوت کا کافی ادراک ہوتا ہے۔ اور بعض سانپ موسیقی سے کیسا مست ہو جاتا ہے۔

چند سال ہوئے امریکہ کے بعض لائٹ لٹریچر کے رسالوں میں اس قصہ نے گشت کیا تھا کہ کسی مقام پر چڑیا کا ایک بچہ سور اتفاق سے چھوٹے سے گڑھے میں گر پڑا۔ مگر گڑھا بچہ کے لئے کافی گہرا تھا۔ ماں باپ نے (اور خود بچہ نے گڑھے سے نکلنے کی) ہر چند کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر انہوں نے یہ کیا کہ کہیں سے ایک مضبوط دھاگا لائے۔ اور اس کو گڑھے کے اندر ڈال دیا۔ بچہ نے اس کا ایک سرا پکڑ لیا۔ دوسرے سرے کو ماں باپ دونوں نے متفقہ کوشش کے ساتھ کھینچا۔ یہ تدبیر بخوبی کامیاب ہوئی اور بچہ نکل آیا۔

چھوٹے جانوروں میں سب سے زیادہ قوت مدرکہ چیونٹی اور شہد کی مکھی میں بتائی جاتی ہے۔ بعض علماے حیوانات نے غور کیا ہے۔ کہ ان دونوں کیڑوں کے بہت سے حالات انسان سے مشابہ ہیں۔ یہاں تک کہ انسان نے ترقی تہذیب میں بھی ان سے بہت کچھ سبق لیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جانوروں کی قوت مدرکہ کا درست اندازہ اس وقت تک مطلق نہیں ہو سکا۔ اور یہ کہ جس شے کا نام عقل حیوانی ہے۔ وہ قدرت الٰہی کا عجیب ترین مظہر ہے۔ (انتخاب لاجواب ۵ جولائی ۱۹۰۵ء)

---

(۲۸)

قہوہ

(خلاصۂ ترجمۂ الہلال مصر)

قہوہ جس کو بُن بھی کہتے ہیں۔ ایک یمنی پودہ ہے۔ جس طرح تمباکو امریکہ سے ۱۶ ویں صدی عیسوی میں اپنے امریکن نام Tobacco کے ساتھ تمام دنیا میں پھیل گیا اور عربوں نے اس کا نام تبغ رکھا اسی طرح قہوہ ۱۷ ویں صدی میں اپنے عربی نام کے ساتھ یمن سے یورپ اور دیگر ممالک متمدنہ میں منتقل ہوا۔ چنانچہ Coffee یا Cafe قہوہ ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ قہوہ یا بُن یمن میں قدیم سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اصل میں یہ منطقہ حارہ کی نباتات میں سے ہے اسی وجہ سے حبش اور اس کے علاوہ دوسرے گرم ملکوں میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے عرق کا پینا جس طرح آج کل مروج ہے۔ قرون آخرہ تک معلوم نہ تھا۔ غالب یہ ہے کہ یمن کے عربوں نے قہوہ کا پینا حبشیوں سے سیکھا۔ اور اس کے بعد عربوں نے ہی اس کو مہذب دنیا میں رواج دیا۔ اس وقت سے قبل "قہوہ" عربوں کے نزدیک ایک شراب کا نام تھا۔ جب بُن کے عرق کا حال ان کو معلوم ہوا۔ تو اس کا نام بھی قہوہ ہی رکھ دیا۔ کیونکہ یہ عرق ان کے نزدیک مسکرات میں شمار ہوتا تھا۔ اسلامی حکومتوں نے اس کے استعمال کی ممانعت کر دی۔ اور اس کے پینے والے

کو سزا دی جاتی تھی۔ اول اول تو لوگ بُن کے پوست کا عرق پیتے تھے اس کے بعد مختلف طریقوں سے اُس کے دانے بھونے جانے لگے۔

مسلمانوں میں اس کی اشاعت کا سبب یہ ہوا کہ مشایخ صوفیہ ذکر اذکار کے لئے شب بیداری کی غرض سے قہوہ کو استعمال کرنے لگے تھے۔ کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پینے سے نیند اُڑ جاتی تھی۔ کتاب عمدۃ الصفوۃ فی حل القوۃ میں ہے کہ جس نے بلادیمن میں سب سے پہلے اس کو پیا وہ جلال الدین ذبحانی متوفی ۸۷۵ھ ہیں۔ اور اس کا قصہ یہ ہے کہ وہ عدن میں تصحیح فتادی کا کام کیا کرتے تھے ایک بار ان کو عدن سے افریقہ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اور وہاں کچھ مدت قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ افریقہ کے باشندے قہوہ کا استعمال کرتے ہیں لیکن وہ خود اس کی خاصیت سے واقف نہ تھے۔ جب افریقہ سے عدن کو واپس آئے تو اُن کو ایک مرض لاحق ہو گیا۔ اس وقت ان کو قہوہ کا پینا یاد آیا۔ قہوہ کے استعمال سے وہ مرض تو جاتا ہی رہا۔ لیکن ساتھ ہی ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی خاصیت یہ ہے کہ غنودگی اور کسل کو دور کرتا اور جسم میں ہلکاپن اور سرور پیدا کرتا ہے۔ جب شیخ جمال الدین تصوف کی جانب متوجہ ہوئے۔ تو شب بیداری کے لئے وہ خود اور اُن کے علاوہ عدن کے دوسرے صوفیا قہوہ سے مدد لینے لگے۔ اور سطالعہ علم اور صنعت و حرفت میں ان کی متابعت سے فقہا اور عوام نے قہوہ کا استعمال شروع کر دیا۔" کتاب عمدۃ الصفوہ کا مصنف لکھتا ہے کہ ابتداءً قہوہ بُن یا اس کی چھال سے نہیں بلکہ ایک اور پتی سے تیار کیا جاتا تھا اور اس کا رواج مختلف مقامات پر تھا۔ جب سرحد عدن تک نوبت پہنچی تو وہ پتی جاتی رہی۔ اور اس کی جگہ بن کا عرق پیا جانے لگا۔ یہ شیخ جلال الدین ذبحانی کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اور اس کی ابتدا عدن میں اس طرح ہوئی کہ شیخ جلال الدین نے ایک شخص سے جو پتی کا قہوہ استعمال کیا کرتا تھا ذکر کیا۔ کہ بُن میں غنودگی دور کرنے کی قوت بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قول کا امتحان کر کے دکھایا۔ اور جب وہاں لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس کا استعمال تھوڑی سی لاگت اور کم محنت سے ہو سکتا ہے تو اسی کو پہلے قسم کے قہوہ پر ترجیح دی گئی۔ پس ظاہر ہے۔ کہ قہوہ کا استعمال ذبحانی کے زمانہ سے پہلے ہی جاری تھا البتہ بُن کی ترویج میں"

سب سے مقدم ہیں۔ بہرحال قہوہ کا عام رواج نویں صدی ہجری سے پیشتر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ یمن سے نکل کر قرب وجوار میں ہوتا ہوا دسویں صدی ہجری میں مصر تک پہنچ گیا۔

مصر میں سب سے پہلے اس کا ظہور صدی مذکور کے پہلے عشرہ میں جامع ازہر کے اطراف میں ہوا۔ اور خود جامع ازہر میں بھی رواق یمن میں یمنیوں (اور وہاں رہنے والے حرمیوں) کے درمیان اس کا استعمال جاری تھا۔ جو لوگ ورد وظائف اور ذکر اذکار میں اپنے اپنے طریقہ کے بموجب مشغول رہتے تھے۔ وہ ہر دوشنبہ اور جمعہ کی رات کو اسے پیتے تھے۔ وہ اسے سرخ رنگ کی مٹی کے بڑے سے برتن میں بھر کر اور پھر چھوٹے چھوٹے پیالوں میں انڈیل کر اپنے احباب کو پلاتے تھے۔ جس شخص کے یہ خدمت سپرد ہوتی تھی۔ اُسے "نقیب" کہتے تھے۔ دور سیدھے ہاتھ سے شروع ہوتا تھا۔ اس وقت کچھ ذکر بھی ہوا کرتا تھا جو غالباً لا الٰہ الا اللہ الملک الحق المبین تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی جو عوام اس جگہ موجود ہوتے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ قہوہ پیتے تھے۔ علامہ ابن عبدالغفار کہتے ہیں کہ "ان لوگوں کے ساتھ قہوہ پینے والوں میں میں بھی ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ غنودگی اور کسل دور کرنے کی نسبت جیسی لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ ویسا ہی ہے کیونکہ میں نے اس کو پی کر ان لوگوں کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر بلا تکلف صبح کی نماز باجماعت پڑھی ہے۔ جامع ازہر میں رہنے والے ہمارے اور بے شمار ساتھی اور اور لوگ بھی قہوہ پیا کرتے تھے۔ اسی طرح عرصہ دراز تک جامع ازہر میں قہوہ پیتا رہا۔ اور وہاں کئی جگہ فروخت بھی ہوا کرتا تھا۔ باوجودیکہ اس کا عام طور سے استعمال مدت دراز سے جاری تھا۔ مگر اس کے پینے سے نہ کسی قسم کا تعرض کیا جاتا تھا۔ نہ اس کی خرید و فروخت سے۔ اور تو اور قہوہ مکہ میں مروج اور خود مسجد الحرام وغیرہ میں اس کا استعمال اس قدر عام تھا۔ کہ کوئی ذکر یا مولد کی مجلس اس سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ اور مکہ کے علاوہ مدینہ منورہ میں تو اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ اس کو اپنے گھروں میں بھی کثرت سے اڑایا کرتے تھے۔

پس اس طرح جب قہوہ کا استعمال مسلمانوں میں عام ہو گیا۔ تو حکومت نے تنبیہہ کی۔ اور بعض فقیہ اس کے عدم جواز کی طرف بھی گئے کیونکہ وہ قہوہ کو مسکرات

میں شمار کرتے تھے۔ اول اول اس کی ممانعت مکہ میں سنہ ۹۱۷ ہجری میں دو عجمیوں
نے کی جو حکیم مشہور تھے۔ یہ لوگ منطق اور کلام میں فضیلت تامہ اور کچھ کچھ طب میں بھی
درک رکھتے تھے۔ یہ لوگ مصر کو دولت غوریہ کے آخری زمانہ میں گئے اور اس وقت
تک وہاں رہے تھے کہ مصر کو سلطان سلیم فاتح نے فتح کر لیا۔ اور وہ سلطنت عثمانیہ
کے دائرہ میں داخل ہو گیا۔ کتاب عمدۃ الصفوۃ کا مصنف کہتا ہے کہ قہوہ کے
معاملہ میں ان دونوں حکیموں کی مدد شیخ شمس الدین محمد حنفی خطیب و قاضی القضاۃ
اور سری الدین بن شحنہ اور ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی کی تھی۔ شیخ
شمس الدین نے امیر خائر بک کو بھی جو اس وقت مکہ کا معمار باشی (ہیڈ انجنیر) اور
محتسب تھا اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ قہوہ کی فروخت بازاروں میں بند کر دی
جائے۔ اور لوگوں کو اس کے پینے سے روکا جائے۔ اور یہ بھی کہا کہ قہوہ میں بہت سی
خرابیاں ہیں۔ یہاں تک کہ خائر بک کو اس سے متنفر کر دیا۔ بلکہ اس کو اس بات پر
آمادہ کیا کہ ایک جلسہ کر کے بالاتفاق اس کی حرمت کا فیصلہ کرے۔ جو لوگ قہوہ کی
حرمت کے درپے تھے۔ انہوں نے اس کے متعلق مصر کو شمس الدین کی ایک تحریر
بھی مع دونوں حکیموں کے فتوے کے بھیجی۔ اور وہاں سے قہوہ کی ممانعت کی
نسبت فرمان سلطانی منگایا۔ خطیب کی تجویز کے بموجب جلسہ ہوا جس کے بعد
خائر بک نے قہوہ کے پینے اور فروخت کرنے کی ممانعت بذریعہ منادی کرا دی تھی
اور یہاں تک سختی کی کہ اس کے بیچنے والوں کو سزا دی۔ قہوہ کی دوکانیں توڑ دیں
سارا اسباب سر بازار جلوا دیا۔ چنانچہ اس کے بعد قہوہ کا بازار تو موقوف ہو گیا مگر
لوگ خائر بک کے خوف سے چھپ چھپ کر اپنے گھروں میں پیتے رہے۔ ایک شخص
کی نسبت اس کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ قہوہ پیتا ہے۔ تو اس نے اس کو سخت سزا دی
اور بازاروں میں گشت کرایا۔ کچھ عرصہ بعد فرمان سلطانی بھی آ گیا۔ مگر نہ اس شکل
پر جیسا کہ مخالفین چاہتے تھے۔ اس سے ان لوگوں کو جسارت ہو گئی۔ کیونکہ ان کو
یہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔ کہ خود مصر میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔ نہ وہاں کے علماء
اس کو برا سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ سے خائر بک کی ساری ہیبت لوگوں کے دلوں
سے جاتی رہی ؛

سنہ ۹۱۸ھ میں امیر قطلبائی مصری قافلے کے ساتھ بجائے خائر بک کے مقرر ہو کر آیا۔ چونکہ امیر قطلبائی قہوہ کثرت سے پیتا تھا اس لئے حرمین شریفین و دیگر مقامات میں روز بروز اس کا استعمال بڑھتا گیا اور کسی قسم کا تعرض نہ رہا۔

سنہ ۹۳۲ھ میں جب محمد بن عراق امیر کہ ہو کر آئے اور ان کو خبر ہوئی۔ کہ قہوہ خانوں میں کچھ ممنوع باتیں بھی ہونے لگیں ہیں۔ تو حکام سے انھوں نے تاکید کر دی۔ کہ قہوہ خانے توڑ دئے جائیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی فی نفسہ قہوہ کی حلت کی تصریح کر دی۔ مدینہ منورہ میں بھی باوجودیکہ محمد بن عراق کا مدت دراز تک قیام رہا۔ مگر قہوہ کے استعمال سے کسی نوع کا تعرض نہ ہوا۔ ایک بار اس کو معلوم ہوا کہ مدینہ میں ایک نوجوان عورت کھلے منہ قہوہ بیچا کرتی ہے۔ اس پر اس کو تنبیہ کی گئی کہ ایسا نہ کیا کرے۔ عورت نے عرض کیا کہ بغیر قہوہ فروشی کے میری بسر اوقات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کو اس شرط پر قہوہ فروشی کی اجازت ہو گئی کہ منہ ڈھکا رکھا کرے۔ عورت نے اس کو منظور کر لیا۔ سنہ ۹۳۳ ہجری میں شیخ محمد بن عراق کی وفات کے بعد پھر وہی پہلی سی کیفیت ہو گئی۔ اور ابھی تک چلی جاتی ہے۔

غرضکہ قہوہ کی حلت و حرمت کی نسبت علما مختلف الرائے ہیں۔ بعض اس کو مسکر سمجھ کر ممنوع قرار دیتے ہیں۔ بعض کا اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر خیال ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جس سے اس کی حرمت کا فتوے دیا جا سکے۔ ایک بار عین ایام حج میں قافلہ شامی کے ہمراہ قہوہ کی ممانعت کا سلطانی حکم بھی مکہ مکرمہ میں پہنچا۔ مگر اس فرمان کی تعمیل صرف چند روز ہو کر رہ گئی۔ اور قہوہ کا استعمال ایک بار جاری ہو کر کبھی موقوف نہ ہوا۔ اور علما صلحا طلبا امرا نے ہر مقام پر اور ہر زمانہ میں اس کی مواظبت کی ۔

قہوہ کے مخالف واویلا کرتے رہے اور قہوہ اپنے قدم جماتا گیا۔ یہاں تک کہ چار دانگ عالم میں منتشر ہو گیا۔ سنہ ۱۶۱۶ء میں یمن سے ہالینڈ پہونچا۔ اور وہاں سے یورپ بھر میں پھیل گیا۔ سنہ ۱۶۴۱ء میں ایک اکریدی الاصل شخص کے ذریعہ سے انگلستان آیا۔ انگلستان میں پہلا قہوہ خانہ سنہ ۱۶۵۰ء میں جیکب نامی ایک یہودی نے قایم کیا تھا اس سے دو سال بعد لنڈن میں ایک تاجر وارد ہوا۔ جو مشرقی ال

و اسباب کی تجارت کرتا. اور جس کے ساتھ ایک یونانی خادم تھا. لنڈن میں پہلا قہوہ خانہ اس تاجر نے ۱۶۵۲ء میں کھولا. اسی طرح دیگر ممالک میں بھی اس کی اشاعت کو سمجھنا چاہئے. قہوہ کے امریکہ پہنچنے تاریخ ۱۷۱۱ء ہے۔

آج کل قہوہ کا دنیا میں جس قدر رواج ہے. اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ تقریباً پندرہ کروڑ پونڈ (پونڈ = تقریباً آدھ سیر) سالانہ دنیا میں صرف ہوتا ہے (چائے کے صرف کا اندازہ ۱۴½ ارب پونڈ سالانہ ہے. صرف برک بونڈ کی چائے ہر روز ۲۰ لاکھ آدمی پیتے ہیں) جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ قہوہ مختلف طریقوں سے بھون کر استعمال کیا جاتا ہے. اگر اس کے بھوننے کی ترکیب بگڑ جائے. تو اس کی خوشبو اور مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ قہوہ کے تاجر اس میں اکثر ایک اور ناقص شے ملا دیتے ہیں. جسے چکوری کہتے ہیں. چکوری قہوہ کے اس قدر مشابہ ہوتی ہے. کہ بغیر خرد بین کے شناخت نہیں ہو سکتی. لیکن لکھنؤ کی طرف ایک ہندو صاحب (مسٹر مہیش چرن سنہا) نے امریکہ میں اپنی تعلیم کے زمانہ میں کوئی ایسی ترکیب ایجاد کی تھی. جس کے ذریعہ سے قہوہ اور چکوری میں آسانی کے ساتھ تمیز ہو سکتی تھی اس ایجاد سے امریکہ میں ان کا بڑا نام ہوا تھا. اور ایک یونیورسٹی نے انہیں اعزازی ڈگری عطا کی تھی. چکوری کے علاوہ بعض اور چیزوں سے قہوہ کو مغشوش کرتے ہیں جزیرہ سماترا کے باشندے بجائے چائے کے قہوہ کے پتے استعمال کرتے ہیں. مگر چونکہ ان میں خوشبودار روغن نہیں ہوتا اس لئے ان کا ذائقہ چائے کا سا نہیں ہوتا ؎

ڈاکٹر چائے اور قہوہ کی مضرتوں کے روز بروز زیادہ قائل ہوتے جاتے ہیں. انگلستان کے دو مشہور ڈاکٹروں (اسمتھ اور رچرڈسن) نے چائے اور قہوہ کے خواص و افعال کے متعلق خاص طور پر غور کیا ہے. اور ان کے تجربوں سے ہے یہ بعض اوقات لوگوں کی موت کا سبب ہوئے ہیں. نیو یارک کے ڈاکٹر مارٹن نے ایک نیا مرض دریافت کیا ہے. جو صرف چائے یا قہوہ کے زیادہ استعمال کرنے والوں کو ہوتا ہے. اسی مناسبت سے اس کا نام "چائے کا مرض" رکھا گیا ہے. ڈاکٹر مارٹن کی تحقیقات سے بڑے بڑے علمائے طب جدید اتفاق کلی ظاہر کر چکے

ہیں ۔ اور جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر چائے اور قہوہ کے تاجر ہیں ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس کے پینے کے بعد فی الجملہ ایک قسم کی فرحت و بشاشت محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن اسی نسبت سے اس کے ردِّ فعل کے وقت تکلیف بھی ہوتی ہے ۔ اس سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں ۔ ان میں انحطاط عمومی یعنی عام کمزوری اور جاع عصبیہ یعنی پٹھوں کا درد اور ضعف معدہ خاصکر قابل ذکر ہیں ۔ جو عورتیں اس کو کثرت سے استعمال کرتی ہیں ۔ وہ اکثر اختناق الرحم میں مبتلا ہو گئی ہیں ۔ نیویارک میں ۱۸۷۹ء سے ایک انجمن چائے اور قہوہ کے استعمال کو روکنے کے لئے قایم ہے ۔ جس کی شاخیں یورپ کے بھی کئی ملکوں میں کھل گئی ہیں ۔ مگر اس انجمن کو ہنوز کوئی معتد بہ کامیابی نہیں ہوئی ۔ بلکہ تمباکو کی طرح اس کے استعمال میں روز افزوں ترقی ہے سہ سعدی

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست

نہ رود جز بوقت مرگ از دست

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قہوہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ افریقہ کے مقام "کافہ" سے عرب میں پہونچا تھا ۔ مگر یہ بات لگتی ہوئی نہیں ہے ۔ کیونکہ اول تو اس نام کا کوئی مقام افریقہ میں تحقیق نہیں ہو سکا ۔ دوسرے یہ کہ اگر نام کی مناسبت کو دیکھا جائے تو "قہوہ" سے "کافی" ہوا ہے نہ کہ بالعکس ۔

فرانس کے بعض مقامات پر دستور ہے ۔ کہ دعوتوں کے موقع پر کھانے کے بعد قہوہ کے دس گلاس پیتے ہیں ۔ ہر گلاس کا نام جدا ہے ۔ پہلا گلاس خالص قہوہ کا ہوتا ہے ۔ دوسرے میں بجائے دودھ کے شراب ڈالتے ہیں ۔ اور پھر ہر گلاس پر شراب کی مقدار بڑھتی جاتی ہے ۔

قہوہ کی بہترین قسم موخا (واقع یمن) میں پیدا ہوتی ہے ۔ مگر بلحاظ کثرت پیداوار کے جاوا ۔ مشرقی و جنوبی امریکہ (علی الخصوص برازیل) بڑھے ہوئے ہیں ریوڈی جینیرو اور سینٹوس قہوہ کی تجارت کے دنیا میں دو بڑے مرکز ہیں

(انتخاب لاجواب ۱۹ جولائی ۱۹۰۵ء)

(۳۱)

سیارۂ مشتری کی سرسری سیر

انسان ضعیف البنیان نے مخلوقات عالم میں سے جن جن چیزوں کو قابل پرستش سمجھکر اپنا معبود ٹھیرایا۔ اُن میں ستاروں نے سب سے بڑا حصہ لیا ہے یہی نہیں کہ کسی ایک قوم نے ستاروں کو پوجا ہو۔ بلکہ متعدد قومیں ان کی مسحور نظر آتی ہیں۔ برطانیہ عظمےٰ کے قدیم باشندوں نے مختلف معبودوں کی عبادت کے دن مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں اتوار کو "سنڈے" اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ کہ اُس دن "سن" یعنی سورج کی پرستش ہوتی تھی۔ اور پیر کا نام "منڈے" اسی لئے ہوا کہ اس روز "مون" یعنی چاند کو پوجا جاتا تھا۔ ایام جاہلیت میں عبادات کے لحاظ سے عربوں کے جو مختلف فرقے تھے۔ ان میں سب سے بڑا فرقہ انہی ستارہ پرستوں کا تھا۔ جس کا پتہ اُن کے ناموں سے چلتا ہے۔ جیسے عبدالشمس۔ عبدالمشتری وغیرہ وغیرہ ؛

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ تمام ستارے بلا استثنا پوجے جاتے تھے۔ نہیں بلکہ وہی جن میں کوئی خاص خصوصیت ہے۔ مثلاً مشتری میں یہ خصوصیت ہے۔ کہ وہ سب سیاروں میں بڑا اور سوائے زہرہ کے سب سے زیادہ چمکدار ہے۔ یہی وہ ستارہ ہے۔ جس کو عرب "مشتری"۔ رومی اور یونانی "جوپیٹر" اور ہنود "برہسپت" کے نام سے پوجتے تھے۔ اور بقول بعض جس کو دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے "ہذا ربی" اور پھر "لا احب الآفلین" کہا تھا ؛

جہاں تک میرا قیاس کام کرسکتا ہے۔ عربوں نے اس کی چمک دمک کو دیکھ کر ہی اس کا نام مشتری رکھا ہوگا۔ کیونکہ لغت عرب میں اس کا مادہ "شری" ہے۔ جس کے معنے "بسیار درخشیدن درخش" یعنی بجلی کے بہت چمکنے کے ہیں۔ عربی میں اس کے اور بھی کئی نام ہیں۔ جیسے سعد۔ سعد السعود۔ سعد اکبر۔ قاضی الفلک ؛

زہرہ کے ساتھ اس کا قران ہونا نجومیوں کے نزدیک بہت مبارک سمجھا جاتا ہے۔ قدیم فلسفی اس کو چھٹے آسمان پر بتلاتے ہیں لیکن فلسفہ جدید کی جو کچھ ان

کے متعلق تحقیقات ہے۔ اس کو میں ابھی بیان کروں گا۔

مشتری کی دو خصوصیتیں تو میں اوپر بتا چکا ہوں۔ کہ وہ سب سے بڑا اور بلحاظ اکثر سب سے چمک دار ہے۔ ان کے علاوہ اس کی دھندلی دھاریاں اور اس کے اقمار بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ دھاریاں جو اس کی چاروں طرف ہیں۔ وقتاً فوقتاً جسامت اور تعداد میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن علی العموم دو چوڑی چوڑی اور ان کی دونوں جانب دو تین پتلی پتلی دھاریاں نظر آیا کرتی ہیں۔ بعض اوقات سب دھاریاں پتلی ہو جاتی لیکن تعداد میں بڑھ جاتی ہیں۔ ہر حالت میں یہ دھاریاں مشتری کے خط استوا کے قریب قریب بالکل متوازی رہتی ہیں۔ ان دھاریوں کی علت عموماً یہ سمجھی جاتی ہے کہ سیارہ مشتری کے گرد جو ہوا کا لفافہ ہے۔ وہ سخت ابر آلود ہے۔ اور جہاں جہاں یہ ابر کسی سبب سے ہلکا پڑ جاتا۔ اور اس کے اندر سے سیارہ کا جرم ذرا صاف نظر آنے لگتا ہے۔ وہیں یہ دھاریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں ہے
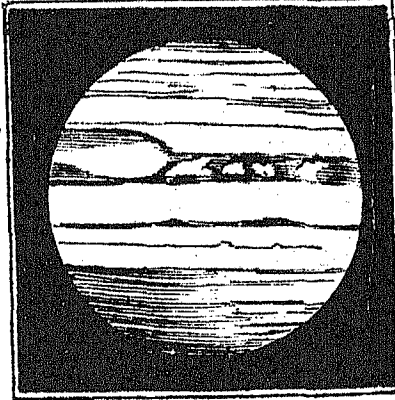
۲۶ نومبر ۱۸۵۶ء کو مشتری کی دھاریاں اس شکل پر نظر آئی تھیں۔

کہ میرا شبہ کس حد تک درست ہے۔ تاہم میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اگر یہ ابر غلیظ مشتری کے محیط نہ ہوتا تو شاید وہ اپنی جسامت کی طرح اپنی روشنی میں بھی آفتاب کے گرد گھومنے والے تمام سیاروں سے سبقت لے جاتا۔ دھاریوں کے پیدا ہونے کے متعلق قواعد نہایت غیر متیقن ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کچھ قواعد ہیں بھی یا نہیں۔ کیونکہ کبھی تو ان میں متواتر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور کبھی مہینوں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ یہ نتیجہ صحیح ہو۔ کہ جب دھاریوں میں جلد جلد تبدیلیاں ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ بڑے بڑے ہوائی طوفان مشتری پر آ رہے ہیں۔ خط استوا کے ٹھیک اوپر بالعموم

کوئی دھاری نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے شمال وجنوب میں ایک ایک چوڑی اور دو دو تین تین پتلی دھاریاں ہوتی ہیں۔ قطبین پر روشنی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اور چونکہ وہاں دھاریاں بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں اس لئے میرے شبہ کو تقویت ہوتی ہے جیسے میں اوپر ظاہر کرچکا ہوں۔ اگرچہ دھاریوں کے متعلق یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ وہ خط استوا کے متوازی رہتی ہیں۔ مگر بہت ہی شاذ موقعوں پر ایسا بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ کوئی دہاری خط استوا سے ۲۰ یا شاید اس سے زیادہ درجہ کا زاویہ بناتی ہے ؂

پہلے یہ خیال تھا۔ کہ مشتری میں سوائے نقرئی بھورے رنگ کے اور کوئی رنگ نہیں ہے۔ مگر گزشتہ ۳۰۔۴۰ سال سے اس میں کچھ شک باقی نہیں رہا کہ بھورا سرخ اور نارنجی رنگ اس میں صاف معلوم ہوتا ہے۔ یہ امر کہ مذکورہ بالا رنگ اسی ۳۰۔۴۰ سال کے عرصہ میں نئے پیدا ہوگئے ہیں۔ یا نو ایجاد طاقت ور آلوں کا نتیجہ ہیں۔ ایسا ہے۔ جس کی کوئی بیّن دلیل موجود نہیں ؂

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دھاریوں پر داغ نظر آتے ہیں۔ جن کا رنگ کبھی دھندلا اور کبھی روشن ہوتا ہے۔ ۱۸۷۸ء کے کئی سال بعد تک گہرے سرخ رنگ کا ایک بیضوی داغ نظر آتا رہا۔ جس کا طول ۲۷ ہزار میل اور عرض ۸ ہزار میل تھا۔ مشتری کے داغوں کو سب سے پہلے ۱۶۶۴ء میں رابرٹ ہک نامی ایک ہیئت دان نے دریافت کیا تھا۔ ۱۶۶۵ء میں دوسرے ہیئت دان نے ان داغوں کے مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ مشتری اپنے مدار پر ۹ گھنٹے ۵۶ منٹ میں گھوم جاتا ہے۔ اس شخص نے مشتری کی حرکت کا مطالعہ ایسے غور سے کیا تھا۔ کہ اس کی اور زمانہ حال کی بہترین تحقیقات میں صرف نصف منٹ کا فرق ہے[1]۔

مشتری کے اپنے مدار پر گھومنے کی مدت (۹۔۵۶ ½) زمین کی مدت (۲۴ گھنٹے) سے نصف سے بھی کم ہے۔ حالانکہ مشتری کے قطر (۸۸ ہزار میل) کے مقابلہ میں زمین کا قطر (۸ ہزار میل) ½ ہے۔ پس اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ

---

[1] یعنی جدید تحقیقات کی رو سے مشتری اپنے مدار پر ۹ گھنٹے ۵۶ ½ منٹ میں گھومتا ہے۔

مشتری کی اپنے مدار پر گردش نہایت سرعت سے ہوتی۔ زمین اور مشتری کی گردش علی الترتیب ۱۱،۷ اور ۴۶۶ میل فی منٹ ہے۔ سریع السیر ہونے سے مشتری کو ایک یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بوجہ بُعد آفتاب کی گرمی اس کو چونکہ کم پہنچتی ہے اس لئے وہ کمی اس تیزی کے ذریعہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ بہ نسبت زمین کے مشتری کا جرم قطبین پر پچکا ہوا ہے زیادہ ہے۔ کبھی کبھی مشتری کی روشنی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ زہرہ کا مقابلہ کرنے لگتا ہے۔ علاوہ بریں مشتری کی سطح میں ایک یہ خصوصیت ہے کہ اُس سے آفتاب کی روشنی سب سیاروں سے زیادہ اُچٹتی ہے۔ لیکن بعض مشاہدہ کرنے والوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ علاوہ مستعار روشنی کے مشتری میں کچھ نہ کچھ ذاتی روشنی بھی ہے۔ لیکن یہ تمام خیالات کم از کم کچھ سال کے لئے بالکل یقینی نہیں ہیں۔ البتہ ایک بات میں شک کی بہت کم گنجایش ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مشتری کو آفتاب کی تو بہت کم حرارت حاصل ہوتی ہے مگر اس کی ابر آلود ہوا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ علاوہ آفتاب کی حرارت کے مشتری کے پاس گرمی کے اور بھی ذرایع ہیں۔

مشتری کے ۵ چاند ہیں۔ ان میں سے چار تو دوربین کی ایجاد کا پہلا نتیجہ ہیں۔ اور گیلیلیو نے ان کو سنہ ۱۶۱۰ء میں دیکھ لیا تھا۔ پانچواں چاند اتنا چھوٹا ہے کہ وہ گیلیلیو کی کمزور دوربین کی رصد میں نہ آسکا۔ اور ۹ ستمبر سنہ ۱۸۹۲ء کو پروفیسر برنارڈ نے اس کو معلوم کیا۔ جن دوربینوں سے مشتری کا یہ پانچواں چاند دیکھا جاسکتا ہے وہ اتنی تھوڑی ہیں کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ پہلے چار چاند چھوٹی چھوٹی دوربینوں سے بھی نظر آسکتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگوں نے ان کو خالی آنکھ سے بھی دیکھ لیا ہے۔ ان چاندوں کا کوئی نام معلوم نہیں ہے۔ امتیاز کے لئے مشتری سے قرب بُعد کا لحاظ کر لیا گیا ہے۔ پانچویں چاند کے متعلق ہنوز کافی حالات معلوم نہیں ہوئے۔ پہلے چاروں میں جو چاند اپنے سیارہ سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس کا بُعد دو لاکھ ۶۲ ہزار میل ہے۔ اور جو سب سے دور ہے اس کا فاصلہ گیارہ لاکھ ۶۹ ہزار میل ہے۔ ہمارے چاند کا فاصلہ زمین سے ۲ لاکھ ۳۷ ہزار تین سو میل اور اس کا قطر دو ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔ مشتری کے چاندوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہایت سریع السیر ہیں۔ چنانچہ پانچوں میں جو سب سے زیادہ بطئی السیر ہے وہ ۱۶ دن ۱۸ گھنٹے

۵ منٹ میں اپنا دورہ پورا کر لیتا ہے۔
مشتری اپنے طریق الشمس پر ۱۱٫۸۶ سال میں گردش کرتا ہے۔ اور اس کا
آفتاب سے بُعد ۴۸ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ خلائے بسیط میں اس کی رفتار ۲۹ ہزار
میل فی گھنٹہ ہے۔ اس کی کشش ثقل کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اگر اس کو
گیند کی طرح اوپر سے چھوڑا جائے تو ۴۱ فیٹ فی سکنڈ کے حساب سے گرے گا۔ مشتری
کی جسامت زمین سے ۱۳۰۹ گنی اور اس کا وزن زمین کے وزن سے ۳ سو ۱۷ گنا
ہے۔ اگر زمین پر ہوا ۹۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے تھوڑی دیر بھی چلے۔ تو کسی
عمارت یا درخت کا اس کے مقابلہ میں کھڑا رہنا ناممکن ہے لیکن مشتری پر ہوا ایک
سو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہفتوں چلتی رہتی ہے لیکن نہیں معلوم وہاں
کی مخلوق کس بلا کی ہے جو تاب مقاومت لاتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ابھی یہ بھی
کما حقہ تحقیق نہیں ہوا کہ وہاں زندہ مخلوق ہے بھی یا نہیں۔ المختصر مشتری کے متعلق
تحقیقات بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ (انتخاب لاجواب ۲۶ جولائی ۱۹۰۵ء)

---

(۴۷)

مقبرۂ انارکلی لاہور

لاہور بلحاظ قدامت۔ تاریخی اہمیت۔ اور ایک صوبہ کا دارالحکومت ہونے
کے ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہے۔ شہر کا قدیم حصہ پختہ فصیلوں اور خدا
کی پناہ عجب عجب نام کے دروازوں کے اندر محصور ہے۔ دوسرا اور نسبتاً جدید حصہ
انارکلی ہے۔ جو صفائی سڑکوں کی وسعت اور چند در چند دوسری مختلف حیثیتوں
سے آبادی کا عمدہ اور دلچسپ ترین حصہ ہے۔ یہیں سے علم کی شیریں نہریں جاری
ہوتی ہیں۔ یہیں میزان عدل ہے۔ اور یہیں تجارت کی منڈیاں ہیں۔ لیکن
باوجود ان تمام بلا امتیاز خصوصیتوں کے بہت ہی تھوڑے لوگ انارکلی کی وجہ تسمیہ
سے واقف ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بعض دوست مجھے یقین دلاتے ہیں کہ لاہور
کے بوڑھے بوڑھے باشندے بھی اس کے متعلق کچھ بتا سکنے سے قطعاً قاصر ہیں

کسی کتاب میں بھی اس کا مفصل حال میری نظر سے نہیں گزرا۔ انارکلی کی نسبت مشاہیر نسواں کی عبارت حسب ذیل ہے "یہ نیک خصال لونڈی اکبر کے محل میں رہتی تھی۔ شہزادہ سلیم سے اس کو انتہا کا عشق ہو گیا تھا آخر جیسا کہ مشہور ہے کہ عشق اور مشک چھپا نہیں رہتا۔ اس کے عشق کی کیفیت تاڑ لی گئی۔ اور اکبر بادشاہ نے ناراض ہو کر اس کو زندہ درگور کرا دیا۔ جب اکبر نے وفات پائی۔ اور جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے اپنی اس شہیدۂ عشق کی یادگار میں اس کی قبر پر ایک خوش نما مقبرہ سنگ مرمر کا تیار کرایا۔ اور نقش و نگار سے اس کو آراستہ کیا۔ شہر لاہور کا سب سے بڑا اور سب سے بارونق بازار اسی مظلوم بیگم کے نام پر انارکلی کہلاتا ہے (دیکھو سک انڈیا)"
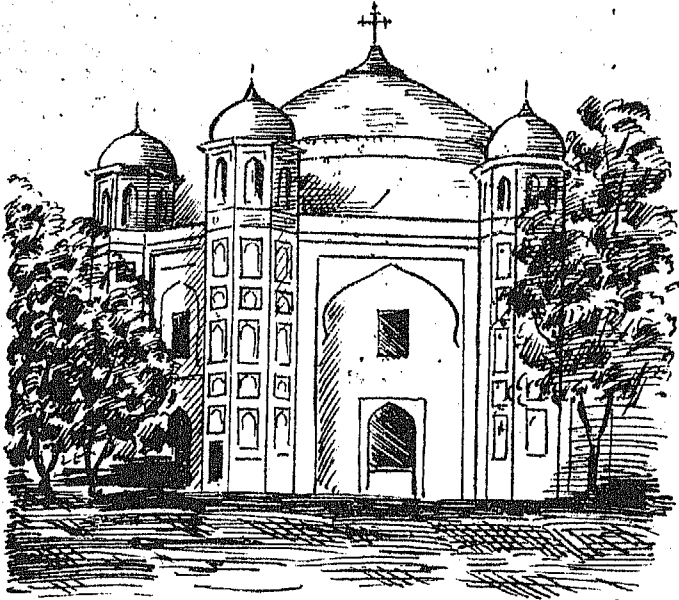
مقبرہ انارکلی لاہور

تاریخ لاہور میں (جو اردو کی ایک ضخیم کتاب ہے) اس کا جو تاریخی حال درج ہے وہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ لکھا ہے "یہ مقبرہ اکبری عمارات کی یادگار شہر لاہور کے باہر گوشہ شیرت میں ابتک موجود ہے ...... جن دنوں میں بادشاہ دکن و خاندیس کی مہموں میں مصروف تھا۔ یہ لاہور میں بیمار ہو کر مر گئی۔ بعض کا قول

ہے کہ مسموم ہوئی بادشاہ کے حکم سے یہ عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا" غرض کہ اس تاریخی عمارت کے حالات اس وقت تک بالکل تاریکی میں ہیں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے۔ اور جس کو میں ہر طرح معتبر سمجھتا ہوں وہ پبلک کی اطلاع کے لئے لکھتا ہوں

اگر ہم گول باغ میں ہو کر لوہاری کا رخ کریں۔ تو سڑک پہ چند سو قدم چلنے کے بعد داہنی جانب ایک تختۂ راہنما نظر آتا ہے۔ جس پر انگریزی میں اس مضمون کی عبارت لکھی ہوئی ہے "دفتر نظامت اور مقبرۂ انارکلی کو" اس عبارت میں الفاظ "مقبرۂ انارکلی" کو پڑھ کر ایک متجسس اور حقیقت جو اجنبی حیرت میں آجائے گا کہ انارکلی اور مقبرہ سے کیا نسبت ہے؟ لیکن میں ابھی بتاتا ہوں کہ ان الفاظ کی غایت کیا ہے۔ مذکورۂ بالا تختۂ راہنما کے برابر کھڑے ہو کر مغرب کی جانب رخ کرنے سے یہ عمارت بالکل سامنے ہو جاتی ہے؛

نادرہ[1] بیگم یا شرف النساء ملقب بہ انارکلی شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے حرم کی ایک پری جمال کنیز تھی۔ ایک روز اکبر اپنے شیش محل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور انارکلی بھی خدمت میں حاضر تھی۔ اتفاقاً اس وقت شہزادہ سلیم موجود تھا اکبر نے آئینہ میں عکس دیکھا کہ انارکلی اور شہزادہ سلیم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے شہزادہ کے ساتھ ناجائز تعلق کا شبہ کر کے اکبر نے حکم دیا کہ انارکلی زندہ چنوا دی جائے۔ سلیم کو اس سے سخت صدمہ ہوا مگر کیا کر سکتا تھا جب اکبر کے بعد وہ نورالدین محمد جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تو اس وقت بھی انارکلی کا خیال اس کو دامن گیر تھا چنانچہ اس نے ذی اختیار ہوتے ہی اپنی کشتۂ ناز کا مقبرہ تیار کرا دیا

انارکلی کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مولف تاریخ لاہور کا یہ قول قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ "اس کا رنگ سرخ تھا" انارکلی کی قبر کا تعویذ نہایت خوب صورت سنگ مرمر کا ایک ہی سل سے تراشا گیا ہے۔ اور اس کی تیاری میں

---

[1] ان حالات کا اکثر حصہ میں نے انگریزی تحریر سے لیا تھا جو مقبرہ انارکلی کے اندر کاغذ کے ایک بورڈ پر لکھی ہوئی آویزاں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تحریر خان بہادر سید محمد لطیف کی مشہور و مستند تاریخ لاہور سے لفظاً لفظاً نقل کی گئی ہے۔ ۱۲۹۷؛

اعلیٰ درجہ کی صناعی صرف کی گئی ہے۔ مسٹر ایڈوک کا قول ہے کہ "دنیا بھر میں سنگ تراشی کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ ہے" تعویذ کے اوپر اور پہلوؤں میں نوے ۹۹ نام اُبھرے ہوئے حروف میں بخط نسخ کندہ ہیں ناموں کے نیچے یہ شعر ہے ؎

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را

مگر دونوں مصرعے ایک ہی طرف نہیں ہیں۔ دوسرا مصرعہ مغربی پہلو پر ہے۔ اور اس کے بعد یہ الفاظ کندہ ہیں "سنہ ۱۰۰۸ ہزار و ہشت"۔ پہلا مصرعہ مغربی پہلو پر ہے۔ جس کے بعد لکھا ہوا ہے:" مجنون سلیم اکبر در لاہور سنہ ۱۰۲۴ ہزار و بست و چار" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تاریخ یعنی سنہ ۱۰۰۸ھ انارکلی کے قتل کی ہے۔ اور دوسری سنہ ۱۰۲۴ھ تعمیر مقبرہ کی۔ جو اکبر کے انتقال سے دس سال بعد کا زمانہ ہے۔

قبر مغربی دروازہ کے مقابلہ میں شرقی محراب کے نیچے ایک چبوترہ پر بنی ہوئی ہے۔ اور اس کا وسط میں زیر گنبد نہ ہونا ایک حیرت انگیز فروگزاشت اور مسلمانوں کے ذوق تعمیر پر ایک بدنما دھبا ہو سکتی ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس زمانہ میں یہ عمارت عیسائیوں کے تحت میں تھی۔ تو انہوں نے تعویذ کو اپنی مناسب جگہ سے اُکھاڑ کر یہاں منتقل کر دیا تھا۔ جہاں اب تک ہے۔

اس عمارت کی قدیم شان و شوکت کا کچھ کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلے اس کے متعلق ایک باغ اور متعدد خوبصورت عمارتیں تھیں۔ دریائے راوی عین اُس کی دیواروں کے نیچے بہتا تھا۔ سکھوں کے عہد میں اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ولی عہد کھڑک سنگھ کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد سکھ فوج کے اطالی افسر ایم ونٹورا کا اُس پر تصرف ہوا۔ جس نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ایک دوسرے جنرل ایم الارڈ کا مکان بھی قریب ہی تھا۔ جب سکھوں کی سلطنت پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو عیسائیوں نے اس کو سینٹ جیمس کا گرجا بنا لیا چنانچہ اس آخری تصرف کی علامت گنبد پر بہت بڑی سنگین صلیب ابھی تک لگی ہوئی ہے۔

مشاہیر نسواں کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے
کہ مقبرہ سنگ مرمر کا تھا۔ اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ جہاں گیر جیسے باجبروت
بادشاہ نے ایسی معرکۃ الآرا عمارت کو ضرور کافی پُرشان بنایا ہوگا۔ مگر نہیں
عمارت پختہ اینٹ کی قدیم مغلیہ طرز تعمیر پر بنی ہوئی ہے۔ عمارت مدور ہے۔ شرقاً
غرباً اس کا پیمانہ ۵۷ فٹ ۱۲ انچ ہے۔ چھت آٹھ بھاری بھاری محرابوں پر
قایم ہے۔ جن کا دور ۱۵ فٹ تین انچ ہے۔ تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ دور سکھ
سلطنت کے وقت میں باغیچہ اجڑ گیا۔ چار دیواری کی اینٹیں خشت فروش گرا
لے گئے۔ مقبرہ باقی رہ گیا۔ اس میں سنگ مرمر کا جو چبوترہ تھا۔ اس کا پتھر مہا
رنجیت سنگھ نے اتروا لیا"۔

کم و بیش آدھ آدھ فٹ اونچی چار سیڑھیاں چڑھ کر چبوترہ پر پہنچتے ہیں۔
سولہ قدم عریض ہے۔ عمارت پختہ اینٹ کی اور دو منزلی ہے۔ نیچے کی منزل میں
آٹھ آئینہ دار دروازے ہیں۔ ہر دروازہ کے اوپر ایک کھڑکی ہے۔ جو اوپر کی منز
میں کھلتی ہے۔ عمارت ہشت پہلو ہے۔ ہر پہلو پر ایک چھوٹا مثمن گنبد ہے۔ ا
گنبدوں کے بیچ میں ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اور اسی گنبد پر وہ سنگین صلیب
لگی ہوئی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ گنبد کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ دو
ہے۔ پہلی منزل کے فرش سے پہلے گنبد تک جتنا ارتفاع ہے اتنا ہی ارتفاع
گنبد سے دوسرے گنبد تک ہے۔ آمد و رفت شمال مشرقی دروازہ سے ہوتی
باقی سات دروازے بند رہتے ہیں۔ اوپر کی منزل کو راستہ اندر باہر دونوں
طرف سے ہے۔ پلستر پر زرد رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اندر کا فرش دو رنگے پتھر کا
خوب صورت ہے۔ مغرب کی جانب مقبرہ کی دیوار سے ملا ہوا ایک عالیشا
برگد کا درخت ہے جس سے اندیشہ ہے کہ کبھی عمارت کو نقصان نہ پہنچے۔ جو
سے (یعنی ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کے مشہور زلزلہ سے) بالکل محفوظ رہی ہے
کی کچھ مخالفت نہیں ہے۔ آج کل اس میں سول سیکرٹریٹ کا گودام ہے۔ گر
لارڈ کرزن نے اس کو خالی کرنے کا حکم دے دیا تھا :

(انتخاب لاجواب ۲۔ اگست ۱۹۰۵ء)

۳۸

کوہ لبنان کے باشندے

لبنان ملک شام کا مشہور پہاڑ ہے۔ اس کے حالات مصر کے مقتدر رسالہ الہلال میں کسی کتاب سے نقل ہوئے ہیں۔ جو ۱۸۳۳ء میں لکھی اور وسط ۱۹ ویں صدی عیسوی میں یورپ میں چھاپی گئی تھی۔ ان حالات نے رسالہ مذکور کے پورے سوا بارہ صفحے لئے ہیں۔ لیکن چونکہ انتخاب میں اس قدر گنجایش نکل نہیں سکتی۔ اس لئے صرف نہایت دل چسپ مقامات کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

یہ پہاڑ سات طبقوں میں منقسم ہے (۱) شوف سویجانی اور شوف حیطی (۲) مناصف (۳) شحار (۴) عزب اعلےٰ اور غرب ادنےٰ (۵) جرد (۶) عرقوب اعلےٰ اور عرقوب ادنےٰ (۷) متن۔ یہ طبقے مختلف فرقوں کی تولیت میں ہیں ان فرقوں کے مدارج متعین ہیں۔ پہلا درجہ امرا کا اس کے بعد مقدمین کا۔ اور اس کے بعد مشایخ کا ہے۔ ان کا دستور ہے کہ حاکم کے حکم سے ان کا کوئی فرد قتل یا قید نہیں ہوسکتا۔ مجرم کے لئے صرف یہ سزا ہے کہ اس کا مال اسباب کھیتی باڑی گھر بار چھین لیا جاتا یا اس کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔ مجرم حاکم کے روبرو حاضر ہوتا ہے تو حاکم سلام وغیرہ میں اس کے ساتھ وہی ہمیشہ کا جیسا برتاؤ کرتا ہے اور کسی قسم کی توہین نہیں کرتا۔ خط وکتابت میں بھی اس کے پہلے القاب و آداب میں فرق نہیں آتا۔ اس کے جرم کا ذکر آنے نہ دیا جاتا ہے۔ البتہ بخلاف معمولی خطوط کے مہر خط کی پیشانی پر لگاتا ہے۔ حاکم کے نزدیک مختلف طبقہ کے لوگوں کے لئے تعظیم کے مدارج بھی متفاوت ہیں۔ حاکم اعلےٰ کی ماتحتی میں جو لوگ ہیں۔ وہ اپنی اپنی حدود کے اندر انتظام کرتے ہیں۔ حاکم ان کی بسر اوقات کے لئے خراج کا کچھ حصہ معین کر دیتا ہے۔ اگر رعایا سے یہ لوگ کچھ بھی زیادہ لیں۔ تو ان کی شکایت ہو جائے اور پھر ان سے سخت بازپرس ہوتی ہے۔ مشاہیر میں کچھ لوگ نصاریٰ بھی ہیں۔ جمہور رعایا دروز اور نصاریٰ ہے لیکن شیعہ وسنی مسلمان اور یہود بھی

ہیں۔ ایسے مقامات نادر ہیں۔ جہاں کی آبادی خالص کسی ایک مذہب کی ہو۔
حاکم اپنے مکتوبات میں رعایا کو بلحاظ مراتب اخ عزیز۔ حضرت عزیز۔ شیخ عزیزنا۔
اعز المحبین کے القاب سے مخاطب کرتا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی بہت عزت
کرتے ہیں کسی غریب کو محض اس کی غربت کی وجہ سے حقیر نہیں سمجھتے اپنی
زبان کو فحش سے بچاتے ہیں دوسروں پر اپنا بوجھ نہیں ڈالتے دھوکہ بازی ان
میں نام کو نہیں۔ یہاں تک کہ اگر دشمن پر بھی حملہ کریں گے۔ تو اول اسے خبردار
کردیں گے۔ غیرت اور حمیت کا مادہ بہت کچھ ہے۔ ایک خاص قوم ہے۔ جو
پہلے بر سر عروج تھی۔ مگر اب اس کا گزارہ کاشت کاری اور ہیزم فروشی پر ہے اس
قوم کے لوگ اس حالت پر بھی سوائے امراء کے عام لوگوں سے سوال تک نہیں
کرتے۔ اگر انہیں عزت کے ساتھ نہ پکارا جائے۔ تو جواب نہیں دیتے دوستوں
کے لئے جان بھی حاضر کر دیتے ہیں۔ کشت وخون کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے مختلف
فرقے باہم سخت تعصب رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ مروت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے
کہتے ہیں کہ دو شخصوں کی باہم دشمنی تھی۔ ایک شخص ان میں سے ایک دن
اپنے دشمن کے گھر میں گھس گیا۔ دیکھا کہ اس کی بی بی کچھ کام کر رہی ہے جو
اس سے ہو نہیں سکتا۔ یہ شخص اس کو مدد دینے لگا۔ اتنے میں اس کا دشمن یعنی
عورت کا شوہر بھی آ پہنچا لیکن بجائے کسی قسم کے تشدد کے اس کی خوب
خاطر مدارات کی۔ اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ ایک کسان ہل جوت رہا تھا
اس کے دو دشمنوں نے تنہا پاکر اس پر حملہ کیا۔ کسان بھاگا۔ مگر پتھر کی ٹھوکر
لگی اور گر پڑا۔ اتنی دیر میں حملہ آوروں نے اس کو جا پکڑا لیکن یہ سمجھ کر کہ اگر ہم
نے اس حالت میں اس کو قتل کر ڈالا تو کوئی فخر کی بات نہ ہوگی۔ قابو میں آئے
ہوئے دشمن کو چھوڑ دیا۔ ایک شخص ابراہیم نامی کو اپنی بی بی کی نسبت کسی
غیر کے ساتھ ناجائز تعلق کا شبہ ہو گیا۔ ایک روز یہ بہانہ کرکے گھر سے چلا گیا
کہ رات کو میں فلاں جگہ رہوں گا۔ جب رات ہو گئی تو چھپ کر گھر میں آیا
اور دیکھا کہ اس کی بی بی دوسرے شخص کے ساتھ میٹھی باتیں کر رہی ہے
ابراہیم کو دیکھ کر دونوں اپنی زیست سے مایوس ہو گئے۔ لیکن ابراہیم نے

ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ البتہ مرد کو ہدایت کر دی کہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا
تھوڑے دن کے بعد عورت کو طلاق دے دی۔ مگر اس عرصہ میں اس سے بالکل
ایسا برتاؤ کیا گویا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس سے ابراہیم کا یہ مطلب تھا۔ کہ لوگ
اس کو اپنے نکاح میں لانے سے پرہیز نہ کریں۔ ایک اور شخص عبداللہ کی نسبت
مشہور ہے۔ کہ ایک دن اس نے اپنے باغ میں جا کر دیکھا کہ ایک آدمی نے بہت سے
پھل توڑ کر ٹوکری میں بھر رکھے ہیں۔ اور ٹوکری کو سر پر رکھ کر اٹھانا چاہتا ہے۔ مگر
بوجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔ عبداللہ نے پیچھے سے جا کر سہارا لگا دیا۔ جب وہ آدمی
کھڑا ہو گیا۔ تو اپنے پیچھے مالک کو کھڑا دیکھ کر سخت گھبرایا۔ مگر عبداللہ نے آئندہ احتیاط
رکھنے کی تاکید کی۔ اور اس سے ذرا بھی تعارض نہیں کیا۔ غرض اس قسم کی مثالیں کثرت سے ہیں
لیکن ان سب کا ذکر کر کے بات بڑھانا منظور نہیں۔ زمانہ قدیم میں یہاں کے باشندے
دو گروہوں میں منقسم تھے۔ رقیبیہ اور یمینہ۔ ان دونوں میں ہمیشہ جنگ و جدل ہوتی
رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ جس وادی میں جنگ ہوا کرتی تھی۔ اس کا راستہ جب مقتولین
کی کھوپڑیوں سے بالکل بند ہو گیا۔ اس وقت ان لوگوں کی لڑائی بند ہوئی۔ چنانچہ
اس وادی کو اب تک "وادی الجماجم" یعنی کھوپڑیوں کی وادی کہتے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں
کی آبادی نسبتہً کم ہے۔ مگر تمام معاملات کا تصفیہ سوائے چند مسائل کے اسلامی
شریعت کے بموجب ہوتا ہے۔ ازدواج کے متعلق ان کے ہاں یہ دستور ہے۔ کہ
جب مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کے رشتہ
داروں کے پاس پیغام بھیجتا ہے۔ اگر وہ رشتہ دار پیغام بر کے ساتھ میٹھے کر حلوے
کی قسم سے کوئی چیز کھا لیں۔ تو سمجھ لینا چاہئے۔ کہ ان کو پیغام منظور ہے۔ ورنہ نہیں
اس کے بعد مہر وغیرہ کا تصفیہ ہو کر معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ اور یہی نکاح ہے کوئی
شخص ایک وقت میں دو بی بیاں نہیں رکھ سکتا۔ زوجہ کو جب چاہے طلاق دے
سکتا ہے۔ طلاق ان کے ہاں نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنی
بی بی سے کہے کہ باغ کو جا اور یہ نہ کہے کہ لوٹ آنا اور وہ قصداً یا سہواً لوٹ آئے
تو بس طلاق ہو گئی۔ مرد عورت دونوں کا لباس نہایت تنگ چست ہوتا ہے۔ اور سب
لباس ایک رنگ کا ہوتا ہے۔ خواص چھوٹے دامنوں کے کپڑے۔ اور ان کے اوپر

دھاری دار لمبا لباس پہنتے اور سر پر عمامہ باندھتے ہیں۔ ڈاڑھی کا رکھنا خواص کے لئے ضروری ہے۔ عورتیں رنگین کپڑے پہنتی ہیں۔ عورتیں گھر سے باہر جانے کے وقت ایک خاص کپڑا پہنتی ہیں۔ جو کمر سے پاؤں تک ہوتا ہے۔ منہ پر بھی کپڑا ڈالتی ہیں جس سے ان کی صرف ایک آنکھ کھلی رہتی۔ باپ۔ چچا۔ ماموں۔ بیٹا۔ بھائی ان سے پردہ درست نہیں۔ عام عورتیں سونے چاندی کا کوئی زیور نہیں پہنتیں ہر عاقل اور عاقلہ کے لئے سال بھر کے اندر اپنی آنکھوں میں دو اوقیہ[1] سرمہ لگالینا ضروری ہے۔ جو لوگ دروز ہیں وہ امور دینی میں بظاہر تو اسلام کے مدعی ہیں لیکن باطن میں ان کے عقائد اور ہی اور ہیں۔ جن کو وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اس مذہب کے پیرو دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ عقال اور جہال۔ جہال صرف نام کے دروز ہیں عقال کے تین درجے ہیں۔ اول خاص جو دینی معاملات سے کماحقہ آگاہ ہیں دوسرے عام جو مذہب کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں۔ شب جمعہ کو عقال کی خاص مجلس وعظ منعقد ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر کچھ کھانے پینے کا بھی سامان ہوتا ہے۔ امور دینیہ کے تصفیہ کے لئے جو شخص معین ہوتا ہے۔ اسے شیخ العقل کہتے ہیں دینوی معاملات قاضی فیصل کرتا ہے۔ جو دروز وغیر دروز سب کے لئے عام ہوتا ہے کچھ مدت کے بعد شیخ العقل کی زیارت ضروری ہے۔ عقال کا تیسرا درجہ متنزہین کے نام سے موسوم ہے۔ جو بڑے عابد اور متقی ہوتے ہیں۔ تمام عمر شادی نہیں کرتے دن بھر روزہ رکھتے ہیں۔ گوشت کھانا بالکل چھوڑ دیتے ہیں بعض میوہ جات کا کھانا بھی ترک کر دیتے ہیں۔ ہر عاقل مسکرات سے پرہیز کرتا ہے۔ حالت غضب میں بھی چلا کر نہیں بولتا۔ جہال دروز کے لئے جو کفار دروز بھی کہلاتے ہیں نماز روزہ کسی دینی امر کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ سوائے علم نجوم اور علم طلسم کے ان میں اور کوئی علم نہیں ہے۔ برائے نام تجارت بھی ہوتی ہے۔ عقاید دینیہ کو بڑی سختی کے ساتھ چھپاتے ہیں۔ ان بلاد میں پانچ سو قریے ہیں۔ جن میں پچاس ہزار نصارے دس ہزار دروز اور علاوہ عورتوں اور بچوں کے ۵ ہزار مسلمان اور یہودی ہیں ؛

(انتخاب لاجواب ۲۔ اگست ۱۹۰۵ء)

---

[1] ۱ اوقیہ = ۴۰ درم۔ درم = ۳ ½ ماشہ۔ ۱۲۹۷ ؛

۳۹
اکس ریز یا شعاع رانجن

اکس ریز یا شعاعِ رانجن زمانہ حال کی حیرت انگیز ترین ایجادوں میں سے ایک قسم کی روشنی ہے جس سے جسم کی اندرونی کیفیت برای العین معلوم ہو سکتی ہے۔ غالباً بالکل مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر ہم یہ کہنے کی جرأت کریں۔ کہ اس روشنی کے دریافت ہونے سے طب جدید کا سرمایۂ فخر و ناز فنّ جراحی دس قدم اور آگے بڑھ گیا اس کے موجد پروفیسر رانجن باشندۂ ورزبرگ جرمنی نے جب ۲۳ جنوری ۱۸۹۶ء کے اخبار نیچر میں یہ اعلان کیا کہ میں زندہ انسانوں اور حیوانوں کے نظامِ عظمی کی تصویریں لینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ تو طبی دنیا میں ہل چل مچ گئی اور عام لوگ بھی دنگ رہ گئے اس میں شک نہیں کہ ایسا ہونا کچھ بے موقع بھی نہ تھا کیونکہ پروفیسر رانجن کی ایجاد سے انسان کے قبضہ میں ایک ایسی قوت آگئی تھی۔ جس سے آگے چل کر بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے بڑے بڑے کام ظہور میں آنے والے تھے۔ اگرچہ ایک ایسی روشنی کا ایجاد ہونا جو انسانی گوشت اور ملبوسات۔ کتابوں کی جلدوں اور لکڑی جیسی ٹھوس چیزوں کے اندر داخل ہو سکے۔ بذاتہ کچھ کم تعجب خیز بات نہ تھی لیکن علی الخصوص ڈاکٹروں کے لئے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ کیونکہ وہ اب اُن چیزوں کو جن کو جسم کے اندر پیشتر بڑی مشکل سے معلوم کر سکتے تھے صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اس ایجاد کا عجیب ترین حصہ خود روشنی تھی۔ کیونکہ وہ نہ تو آفتاب کی روشنی تھی۔ نہ معمولی برقی روشنی۔ دنیا کی بہت سی بڑی بڑی ایجادوں کی طرح اکس ریز کی ایجاد محض اضطراری تھی۔ ایک دن رانجن کروکز کی نلی سے کچھ تجربہ کر رہا تھا جو شیشہ کی ایک نلی ہوتی ہے۔ اور اگر اس کے اندر کی ہوا نکال کر بجلی کی تو ی رو اس میں داخل کی جائے۔ تو اس سے ایک خاص قسم کی روشنی پیدا ہوتی ہے، اگر رانجن کی نلی پر چاروں طرف سیاہ کاغذ منڈھا ہوا اور کمرہ میں بالکل اندھیرا تھا۔ یکایک کاغذ روشن ہو گیا اور اس کی چمک کم و بیش دو دو گز تک پہنچنے لگی۔ رانجن اور نیز دوسرے لوگوں کے

مسلسل تجربوں نے جن میں سب سے بڑا حصہ رانتجن کا ہے ثابت کر دیا کہ ان شعاعوں کی راہ میں لکڑی یا اس قسم کی اور بہت سی چیزیں مطلق حایل نہیں ہوتیں۔ اور شعاعیں ان کے اندر آسانی سے نفوذ کر جاتی ہیں۔ اور سوائے ہڈی یا لوہے جیسی سخت چیزوں کے ان کا روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ مثلاً اگر ہم اپنے ہاتھ کا فوٹو لیں۔ تو اس سے وہ معمولی شکل پیدا ہوگی۔ جو ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں لیکن اگر فوٹو اکس ریز کے ذریعہ سے لیا جائے۔ تو گوشت پوست اور اعصاب و شرائین غائب ہو کر صرف ہڈیوں کے ڈھانچ کی تصویر آجائے گی۔ جرّاحوں کو اس سے بہت بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ کیونکہ ان شعاعوں کے ذریعہ سے مقام ماؤف کا پتہ بہت جلد لگ جاتا ہے اور شبہ میں متعدد جگہ عمل جرّاحی نہیں کرنا پڑتا فرض کیجئے کہ میدان جنگ میں کسی سپاہی کے جسم کے اندر گولیاں رہ گئیں۔ تو اب اشعۂ رانتجن کی مدد سے فوراً دریافت ہو سکتا ہے۔ کہ گولیاں جسم کے کس کس حصہ میں ہیں۔ ورنہ پیشتر جسم کو چھلنی کی طرح چھیدے بغیر گولیوں کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ خدا اس کے موجد پر رحم کرے۔ اس کے ذریعہ سے مریضوں کے دکھ میں کتنی تخفیف ہو گئی۔ جراحوں کے علاوہ ڈاک خانہ اور پولیس والے بھی اس سے مدد لیتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے پارسلوں کے اندر کی چیزیں معلوم کر کے ممنوع البیع چیزیں روکی جا سکتی ہیں۔ غرض کہ اکس ریز بھی خدا کی دی ہوئی قوتوں کا عجیب ترین نمونہ ہیں۔ اشعۂ رانتجن کی وجہ تسمیہ بتانے کی تو غالباً ضرورت نہیں۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ اس کی نسبت اس کے موجد رانتجن کی طرف ہے۔ البتہ اکس ریز کی ترکیب اردو خوان پبلک کو بتا دینی ضروری ہے۔ ریز کے معنی تو شعاعوں کے ہیں۔ اور اکس جو انگریزی حروف تہجی کا ایک حرف ہے رانتجن کے نام کا پہلا حرف ہے جس نے اس ایجاد کی ترقی میں بہت کچھ حصہ لیا تھا۔ گویا اکس ریز کے معنی اشعۂ رانتجن ہیں۔ اس کا ایک اور نام "لاشعاع" بھی ہے۔ امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے دریافت کیا ہے کہ اکس ریز کے ذریعہ سے کالا رنگ گورا کیا جا سکتا ہے چنانچہ وہ کامیابی کے ساتھ اس کا بارہا تجربہ کر چکا ہے اور کئی عنبر فام زنگی کافور رنگ ہو چکے ہیں۔ اگر ان تجربوں میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی۔ تو کالے رنگ کا نہ رہنا یقیناً انسان کے اختیار میں ہو جائے گا۔ والغیب عنداللہ

(انتخاب لاجواب ۱۶۔ اگست ۱۹۰۵ء)

سلطان صلاح الدین کا اعلان

سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح ارض مقدس (از ۵۶۴ھ تا ۵۸۹ھ) بڑا جانباز اور مستقل مزاج سپاہی تھا۔ اس کی تلوار سے کہیں پناہ نہ تھی۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں اس نے یورپ بھر کی متفقہ فوجوں کا شیرازہ ایسا پراگندہ کیا تھا۔ کہ پرانی دنیا کے سارے سلاطین اس سے کانپنے لگے تھے۔ ادھر اسلام اس پر فخر کرتا تھا اُدھر یورپ پر اس کا رعب ایسا طاری ہوا تھا۔ کہ مائیں بچوں کو اس کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ بایں ہمہ سطوت و جبروت وہ بڑا عالم اور خدا ترس تھا۔ اس کے عادلانہ قوانین نے رعایا کے دل میں اس کو نہایت ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ آخری وقت میں اس نے جو کچھ کیا۔ وہ اس امر کا عمدہ ثبوت ہے کہ دنیا اس کی نظر میں کس قدر بے ثبات تھی۔ جب وفات کا وقت قریب پہنچا۔ تو اس کی اپنی گزشتہ شان و شوکت کی تصویر نظروں کے سامنے پھر گئی۔ اور وہ خیالات میں محو ہو گیا۔ جب کچھ ہوش آیا۔ تو اس نے حکم دیا۔ کہ میرا کفن تیار کر کے میرے سامنے لاؤ۔ اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ اس کے بعد سلطان نے اپنا وہ جھنڈا طلب کیا۔ جس کے سایہ میں اس کے فاتح اور غیر مفتوح سپاہیوں نے سینکڑوں فتحیں حاصل کی تھیں۔ جب جھنڈا آیا تو صلاح الدین نے اس کا ریشمی کپڑا اتروا کر اس کی بجائے اپنا کفن بندھوا دیا۔ کچھ دیر تک صلاح الدین خود اس عبرت ناک منظر کو دیکھتا رہا۔ اور پھر حکم دیا کہ منادی کرنے والے اور مرثیہ خوان دمشق کے ہر گلی کوچہ میں اس کو لے کر پھریں اور پکار پکار کر اعلان کریں کہ زبردست صلاح الدین کے پاس بس اب یہ باقی رہ گیا ہے۔ جس وقت یہ عجیب و غریب جلوس دمشق کے عظیم الشان شہر میں گشت کر رہا تھا۔ تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے بے اختیار آنسو جاری نہ ہوں ہر لب پر مہر خاموشی لگی ہوئی تھی۔ آفتاب کے غروب اور آسمان پر ستاروں کے نمودار ہوتے ہی صلاح الدین کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ اور اس وقت جب کہ اس کو دنیا سے گئے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہ آرام سے اپنی لحد میں قیامت تک کے لئے پاؤں پھیلائے سکھ نیند سو رہا ہے۔ (انتخاب ۔ لاجواب ۲۲ ۔ اگست ۱۹۰۵ء)

۴۴ مکافات عمل

(عربی سے ترجمہ)

کہتے ہیں کہ کسی بادشاہ کے زمانہ میں فیاض نامی ایک نہایت مخیر شخص تھا۔ وہ غربا کی ہمیشہ پرورش کیا کرتا۔ اور کسی کی مصیبت کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اپنے اسم بامسمیٰ ہونے کی وجہ سے وہ اتنا مشہور ہوگیا تھا کہ بادشاہ تک اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ زمانہ اس سے پھر گیا۔ اور وہ خود بالکل تنگ دست ہوگیا۔ اس وقت وہ لوگ بھی جن کے اڑے وقتوں میں فیاض کام آیا تھا۔ اس سے کترانے لگے۔ جب دوستوں کی یہ حالت دیکھی تو فیاض خانہ نشین ہوگیا۔ کچھ دن تک تو گھر میں جو اثاثہ تھا وہ بیچ بیچ کر کھایا۔ لیکن وہ بھی ختم ہوگیا تو فاقہ پر فاقے ہونے لگے۔ بادشاہ کی طرف سے اس مقام کا جو حاکم تھا جب اس نے فیاض کو بہت دن سے نہ دیکھا۔ تو لوگوں سے اس کا حال پوچھا۔ اور جب اس کو معلوم ہوا کہ فیاض تنگ دستی کی وجہ سے گھر سے نہیں نکلتا۔ تو اسی دن رات کو بہت سا نقد لے کر فیاض کے گھر پہونچا اور اس کو وہ نقد دے دیا۔ فیاض نے اس عطیہ کو شکریہ کے ساتھ قبول کرکے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے۔ حاکم نے اپنا نام بتلانے سے انکار کیا۔ اس پر فیاض نے کہا۔ کہ اگر آپ اپنا نام نہ بتائیں گے۔ تو میں آپ کے عطیہ کو بھی قبول نہ کروں گا۔ مجبور ہو کر حاکم نے فرضی نام حنیتم بتا دیا۔ روپیہ کی تھیلی لے کر فیاض گھر چلا گیا۔ اور بی بی سے کہا کہ خدا نے یہ تھیلی بھیجی ہے۔ ذرا چراغ لاؤ دیکھوں تو اس میں ہے کیا۔ فیاض کی حالت یہاں تک ردی ہوگئی تھی کہ اس کے گھر میں چراغ کے لئے ایک بوند تیل بھی نہ تھا۔ آخر بڑی بے تابی کی حالت میں صبح ہوتے ہی دیکھا تو تھیلی روپیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جو کچھ قرض تھا وہ سب ادا کرکے بادشاہ کے دربار کی تیاری کی۔ فیاض بادشاہ کی حضور میں پہنچا۔ تو اس نے بڑی خاطر مدارات کی اور حیرت سے اتنے عرصہ تک غائب رہنے کا سبب پوچھا۔ فیاض نے اپنی ساری سرگزشت بیان کی۔ بادشاہ کو یہ حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اور اس سے کہا کہ ایسی حالت میں تمھیں میرے

پاس چلا آنا چاہیئے تھا۔ فیاض نے عرض کیا۔ کہ حضور ضعف نے اس قدر سکت باقی نہ چھوڑی تھی۔ کہ حاضر ہو سکتا۔ بادشاہ نے حاکم شہر کی نسبت استفسار کیا کہ اس نے تمہاری کچھ مدد نہیں کی۔ اور جواب نفی میں ملنے پر فیاض کو فوراً پروانہ لکھ دیا کہ حاکم سابق معزول ہو کر فیاض اس کی جگہ مامور ہو۔ فیاض نے شاہی فرمان حاکم کو دکھا کر فوراً حکم دیا کہ اس کو گرفتار کر لیا جائے۔ اور تاوقتیکہ خزانہ اور سرکاری مال و اسباب کی اچھی طرح جانچ پڑتال نہ ہو جائے اس کو نظر بند رکھا جائے۔ الغرض محاسبہ شروع ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم کے ذمہ ایک کثیر سرکاری رقم برآمد ہوئی۔ حاکم کی بی بی کو جب اس کی اطلاع ہوئی۔ تو اسے اور تو کچھ بن نہ پڑا البتہ ایک تدبیر سوجھی اس نے اپنی لڑکی سے جو نہایت ہوشیار تھی کہا کہ تو فیاض کے پاس جا۔ اور اس کو علیحدہ تنہائی میں لے جا کر کہنا کہ کیا حیثم کی نیکی کا بدلہ یہی تھا۔ لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ اور جب فیاض کو معلوم ہوا کہ حیثم یہی شخص تھا تو وہ قید خانہ کو گیا۔ اور حیثم کی بیڑیاں اپنے ہاتھ سے کاٹیں۔ اور حمام میں لے جا کر اسے نہلایا دھلایا۔ اور دوسرے دن یہ دونوں پایہ تخت کو روانہ ہوئے۔ جب بادشاہ کو اطلاع ہوئی۔ تو اس نے کہا کہ فیاض اب تو ملازم سرکار ہے۔ بلا طلب کس طرح چلا آیا۔ لیکن جب فیاض بارگاہ شاہی میں پہنچا۔ تو سارا قصہ سنایا۔ بادشاہ نے حیثم کی جس کا اصلی نام رشید تھا۔ بہت عزت کی اور اس کو کسی دوسری جگہ کا حاکم کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سچی نیکی کبھی ضایع نہیں ہوتی۔ اور کبھی نہ کبھی خدا اس کا اجر ضرور دیتا ہے

(انتخاب لاجواب ۲۳ اگست ۱۹۰۵ء)

۴۲

جغرافیائی انکشافات

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سب سے پہلے زمین کی نسبت جو خیال قایم ہوا تھا وہ یہی تھا۔ کہ زمین چپٹی اور مدور اور ہر طرف پانی سے گھری ہوئی ہے۔ شام مغربی ساحل پر فنیشیا والے پہلی قوم تھے۔ جنہوں نے دوسری قوموں کو دور دراز ملکوں کے حالات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بحیرہ روم کے ہر حصہ کی تحقیقات کر کے

مختلف مقامات پر سرسبز نو آبادیاں قایم کیں۔ ان کے جہاز بحر اطلانطک میں داخل ہو کر شمال کی طرف بڑھتے بڑھتے برطانیہ کی مغربی سرحد تک پہنچ گئے۔ جہاں سے وہ ٹین اور سیسہ لے جاتے تھے ما سی تجارت کی وجہ سے اہل فنشیا نے برطانیہ کا نام ٹین والے جزیرے رکھا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں بعض فنشیا والوں نے جو نیکو فرعون مصر کے ملازم تھے۔ پہلے پہل افریقہ کے گرد بحری سفر کیا۔ اور بحیرہ احمر سے چل کر بحیرہ روم کی راہ سے واپس آئے۔ ایک یونانی فلاسفر تھیلز نے جو تقریباً سنہ [illegible] قبل مسیح میں تھا۔ زمین کے گول ہونے کی تعلیم کی۔ چنانچہ نقشوں کی ایجاد بھی اسی کے ایک شاگرد سے منسوب کی جاتی ہے۔ سیلیا جس کو اب ماسیلز کہتے ہیں۔ وہاں کے پائتھیاس نامی ایک بہادر جہاز ران نے تقریباً سنہ [illegible] قبل مسیح میں مشرقی ساحل کا دورہ کیا۔ ایک بار اور چھ دن تک سفر کرنے کے بعد وہ تھیول پہنچا۔ جو کہر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور جہاں اس نے دیکھا۔ کہ آفتاب برج سرطان وجدی میں ہونے کے زمانہ میں ۲۴۔۲۴ گھنٹے تک افق ہی پر رہتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تھیول جزائر شٹلینڈ ہیں۔ بعض آئسلینڈ کو تھیول بتاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پائتھیاس بحیرۂ بالٹک کے جزیرہ نمائے جٹلینڈ کے گرد بھی پھر آیا تھا۔ ہندوستان اور یوروپ کے مابین خشکی کی تجارت زمانہ قدیم سے جاری تھی اور ساحل مالابار سے بحیرہ احمر کو جانے والے جہاز بھی کنارہ کے قریب ہی قریب چلا کرتے تھے۔ سنہ ۳۲۵ قبل مسیح میں سکندر اعظم کی مہم ہندوستان نے مشرق کی نسبت یوروپ کی واقفیت کو بہت کچھ ترقی دے دی۔ سکندر نے ایک بیڑہ طیار کیا تھا۔ جو پنجاب سے سندھ میں ہوتا ہوا خلیج فارس کو روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد کے زمانہ میں ایک اور جہاز راں ہپالس موسمی ہواؤں کا خیال کر کے جنوب ومغربی مانسون کے ساتھ افریقہ سے سیدھا سمندر کی راہ سے ہندوستان کو چل کر دوسرے موسم میں شمال ومشرقی ہوا کے ساتھ لوٹ گیا۔ تقریباً سنہ ۲۰۰ قبل مسیح میں ایک یونانی فلاسفر ایرٹاستھینز نے جس کی سپردگی میں عظیم الشان کتب خانہ اسکندریہ تھا۔ سب سے پہلے طول البلد اور عرض البلد کا استعمال کیا۔ اس نے عرض البلد کے ایک درجہ کی پیمایش کر کے زمین کی جسامت کا اندازہ کرنے کی بھی کوشش

کی۔ اور یہی طریقہ فی الحال مروج ہے۔ اسکندریہ کے ایک اور فلاسفر نے بھی جو ہیئت کے
ایک رسالہ کا مصنف تھا جغرافیہ عام لکھا۔ جس کے ساتھ نقشے بھی چھپے۔ اور یہ
کتاب پندرھویں صدی تک اس فن کی درسی کتاب رہی۔ اس کتاب سے بحیرۂ روم
اور بحیرۂ اسود کے اطراف کے ممالک کا نہایت صحیح حال معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایشیا کو
جنوب میں افریقہ سے ملا ہوا بتایا گیا ہے۔ اور امریکہ کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ تقریباً سنہ ۸۶۱ء
میں اسکینڈے نیویا کے ایک بحری قزاق کا جہاز طوفان کی وجہ راستہ چھوڑ کر
آئس لینڈ پہونچ گیا۔ جو اس وقت غیر آباد تھا۔ اس کے بعد ناروے کے باشندوں
نے گرین لینڈ کو دریافت کیا۔ اور اس پر آباد ہوئے۔ چند سال بعد گرین لینڈ کے
ایک جہازران کو جنوب و مغرب کی جانب خشکی نظر آئی۔ چنانچہ اس نئے ملک کے
دریافت کرنے کے لئے مہم نوواسکاشیا تک پہونچی۔ ناروے والوں نے اسے
آباد نہیں کیا۔ بلکہ لکڑی اور سمور لینے اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ حال میں آئس لینڈ
سے کچھ مسودات دستیاب ہوئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ناروے والوں
کو امریکہ کا علم تھا۔ پندرھویں صدی اس براعظم سے یورپ والے محض لاعلم تھے
کرسٹافر کولمبس (متولد سنہ ۱۴۴۵ء) اپنے زمانہ کا بڑا جہازراں تھا۔ اس کا خیال
تھا کہ اگر زمین گول ہے تو یورپ سے ہندوستان جانے کا راستہ مشرق اور مغرب
دونوں طرف سے ہونا چاہئے۔ ہندوستان کا مشرقی راستہ تو معلوم تھا۔ مگر کولمبس
کی غرض یہ تھی۔ کہ مغربی راستہ بھی معلوم ہونا چاہئے۔ لیکن جو سنتا تھا بجائے
مدد کرنے کے کولمبس پر ہنستا تھا۔ آخر بصد دقت سنہ ۱۴۹۲ء میں آئزبلا ملکہ اسپین نے
اسے تین چھوٹے چھوٹے جہاز دئیے۔ چند ہفتے چلنے کے بعد جب کولمبس جزائر
بہاما میں پہونچا۔ تو اس نے خیال کیا کہ میں ہندوستان پہنچ گیا۔ اسی وجہ سے اس
نے ان جزیروں کا نام جزائر غرب الہند اور اس کے باشندوں کا انڈین (ہندوستانی)
رکھا۔ سنہ ۱۴۹۸ء میں اپنے تیسرے سفر میں کولمبس جنوبی امریکہ میں پہنچ گیا۔ شمالی
امریکہ کو سنہ ۱۴۹۷ء میں کیبٹ نے جو ہنری ہشتم شاہ انگلستان کی ملازمت میں تھا دریافت
کر لیا تھا۔ سنہ ۱۵۱۳ء میں ایک چھوٹی سی اسپینی نوآبادی کے گورنر بلبوا نے بحر پاسفک
کو دریافت کرکے اس کا نام بحر جنوبی رکھا۔ کیونکہ پہلے پہل وہ اسی جانب معلوم ہوا تھا

میگیلن نامی ایک پرتگالی نے امریکہ کے جنوب میں کئی مقامات دریافت کئے۔ اور چونکہ اثنائے سفر میں ہوا موافق رہی تھی۔ اور سمندر میں کسی قسم کا تموج و تلاطم نہ تھا اس لئے اس نے بحر جنوبی کا نام پیسیفک (ساکن و پرامن) رکھا جو بگڑ کر اب پاسفک ہو گیا ہے۔ اگرچہ میگیلن سفر ہی میں مارا گیا۔ مگر اس کا ایک جہاز راس امید پر ہوتا ہوا اسپین پہنچ گیا۔ اور یہ پہلا جہاز تھا۔ جس نے زمین کے گرد سفر کیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کا شمال و مغربی راستہ دریافت کرنے کی کوشش ہوتی رہی۔ مگر اس میں ہنوز کامیابی نہیں ہوئی البتہ اس سمندر گردی کی وجہ سے بہت سے نئے مقامات معلوم ہو گئے۔ پندرہویں صدی تک یورپ والوں کو افریقہ کے مغربی ساحل کے متعلق بھی کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ اس وقت جہازرانی میں پرتگالی اول نمبر پر تھے۔ اور انھوں نے افریقہ کو بہت سی مہمیں روانہ کیں۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۴۸۶ء میں بارتھولومیو ڈائز افریقہ کے جنوبی گوشہ پر پہنچ گیا۔ اور چونکہ اس کو راستہ میں سخت سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اس لئے اس نے اس راس کا نام کیپ آف اسٹارمس (راس طوفان) رکھا۔ مگر شاہ پرتگال نے اس کو کیپ آف گڈ ہوپ (راس امید یا راس رجائے صالح) کے نام سے پکارا۔ کیونکہ اسے امید تھی کہ یہاں ہو کر اس کے جہاز سیدھے ہندوستان نکل جایا کریں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۴۹۷ء میں ایک دوسرے پرتگالی ملاح واسکوڈیگاما نے اس کی یہ امید پوری کر دی اور راس امید پر ہوتا ہوا کالی کٹ پر آنکلا۔ آسٹریلیا سنہ ۱۶۰۱ء اور نیوزیلینڈ سنہ ۱۶۴۲ء میں دریافت ہوا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں بحر منجمد جنوبی کے بہت سے مقامات منکشف ہوئے قطب نما کے ذریعہ سے ملاح اب نہایت آسانی سے بحری سفر کرتے ہیں اور آفتاب یا ستارے نظر بھی نہ آئیں تو بھی منزل مقصود پر بے تکلف پہنچ جاتے ہیں۔ یہ آلہ قدیم چینیوں کو عرصہ سے معلوم تھا۔ مگر اس کا علم یورپین ملاحوں کو بارھویں صدی عیسوی تک نہ تھا۔ باوجودیکہ جغرافیائی تحقیقات صدہا سال سے جاری ہے۔ مگر آئے دن نئے مقامات کا پتہ لگتا رہتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی مخلوق کس قدر غیر متناہی ہے جل شانہ ؎

کنہت مجہولِ اہل ادراک افراد ہمہ کہ ما عرفناک

(انتخاب لاجواب ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۰۵ء)

۴۴

ستاروں کی نصیحت

ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔ کہ اگر آسمان پر ابر نہ ہو تو سورج ڈوبتے ہی تارے نکل آتے ہیں۔ پہلے ایک نظر آتا ہے۔ پھر دوسرا۔ اس کے بعد تیسرا۔ اور تھوڑی دیر میں نیل گوں آسمان پر موتی سے بکھر جاتے ہیں۔ اگرچہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے۔ وہ یہی تماشا دیکھتا چلا آیا ہے پھر بھی جو لوگ سمجھدار ہیں۔ اور جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز کو بے کار نہیں پیدا کیا۔ وہ ان آسمانی چراغوں سے بڑی قیمتی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اللہ میاں نے متعدد جگہ ان ستاروں کا ذکر کر کے اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے۔ اس لئے دیکھنا چاہیئے۔ کہ ہم ان سے اپنی سمجھ کے مطابق کیا سیکھ سکتے ہیں؟
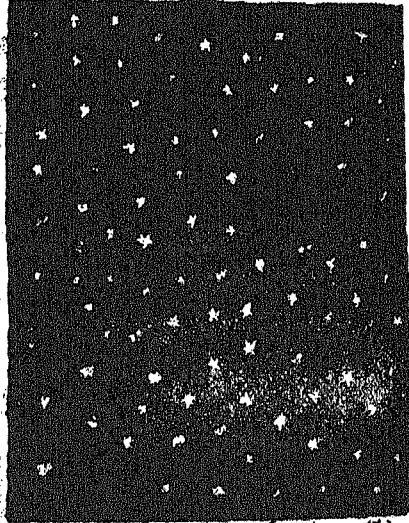
(آسمان کے ستارے)

تم نے خیال کیا ہوگا کہ رات جتنی اندھیری ہوگی۔ اتنی ہی ان کی چمک دمک زیادہ ہوگی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ جب انسان پر مصیبت پڑتی ہے۔ جب کہ وہ چاروں طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور جب کہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس کی روحانی قوت جوش مارتی ہے۔ اور وہ خدا کا دھیان کرتا ہے۔

ستارے چمکنے کے ساتھ ہی حرکت بھی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کہ جب تک جئیں بے کار نہ رہیں۔ بلکہ خدا کی یاد کے ساتھ دنیا کے کام بھی کرتے رہیں۔ تاکہ دین دنیا دونوں میں سرخ روئی ہو۔

بعض ستارے دیکھنے میں تو چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی روشنی بہت سے بڑے ستاروں سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اسی طرح چھوٹے بچے بھی نیکی

میں بڑے آدمیوں کی برابری کر سکتے ہیں۔ ستارے ایک ساتھ چمکتے اور اس ذریعہ سے ہمیں اتفاق کی ہدایت کرتے ہیں۔ اگر آسمان پر صرف ایک ستارہ چمکے تو اس کی روشنی معلوم بھی نہ ہو۔ لیکن چونکہ بہت سے مل کر چمکتے ہیں۔ اس لئے اندھیری سے اندھیری رات کو بھی روشن کر دیتے ہیں! اسی طرح ہم اگر اتفاق رکھیں تو مشکل سے مشکل کام بھی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ خدا نے جس ستارہ کو جو راستہ بتا دیا ہے اس سے وہ بال برابر نہیں ہٹتا۔ ہم کو بھی چاہیئے کہ خدا کے حکم کی دل سے تعمیل کریں ستاروں کی چال میں ذرا بھی آواز نہیں ہے۔ اس لئے انسان جو نیک کام کرے۔ خاموشی سے کرے۔ یہ نہیں کہ اس کو شہرت دے کر تعریف اور نام آوری کا طالب ہو۔ ستاروں کے چمکنے میں خود ان کا ذرا سا بھی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں لازم ہے۔ کہ جو کچھ کریں۔ خدا کے واسطے کریں۔ اور اسی سے اجر کے خواستگار ہوں۔ کیونکہ اگر وہ ہمیں کسی بات کے کرنے کی قوت اور توفیق نہ بخشے تو قیامت تک ممکن نہیں کہ ہم اُسے کر سکیں ؎ انیس

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہو گا ترے کرم سے ہوگا

(بچوں کا اخبار اکتوبر ۱۹۰۵ء)

۴۵

طب اور اسلام

طب کی دو قسمیں ہیں ایک وہبی۔ جو ہر زمانے اور ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ دوسری کسبی۔ جس کا مدار تعلیم و تعلم پر ہے اور اس لئے صرف انھی اقوام میں پائی جاتی ہے۔ جن کو تمدن نے اپنے آغوش ناز میں پرورش کیا ہو۔ اسلامی مورخ نہایت قوی دلائل کی بنا پر یقین واثق رکھتے ہیں کہ مسلمان ایک مہذب اور شائستہ قوم رہ چکے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ مسلمان اس تہذیب و شائستگی کو کس طرح کام میں لائے۔ بہت بڑی استعداد درکار ہے جس کی نسبت مجھے معمولی کسر نفسی کو بالائے طاق رکھ کر صاف دلی سے اقرار کرنا چاہیئے کہ معمولی

دو ہی بات ہے۔ لیکن جن لوگوں نے بحر تحقیق میں غوطہ زنی کی ہے۔ انھوں نے فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ مسلمانوں میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے۔ جو حقیقی شائستگی کی جائز مدعی اور شستی کی آڑ میں شکار نہ کھیلنے والی قوموں میں پائے جا سکتے ہیں ؛

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ مہذب حکومت کا زمانہ تھا۔ انتظام کے جدا جدا صیغے قایم تھے۔ اور ہر صیغہ کا وزیر یا سکرٹری الگ تھا ہمیشہ تیسویں برس تمام اراضی کی پیمایش ہوتی تھی۔ اور زمین کی افزایش اور لیاقت کے لحاظ سے دفتر خراج کی اصلاح و ترمیم ہوتی تھی۔ پبلک ورکس یعنی منافع عامہ کا وسیع محکمہ تھا۔ جو سڑکوں کی درستی۔ پلوں کی مرمت۔ شہر کی صفائی حفظان صحت اور اس قسم کے تمام امور کا متکفل تھا۔ غرض ایک مہذب سلطنت کے جو لوازمات ہیں وہ سب تھے۔" خلاصہ کلام یہ کہ ایک انصاف پسند اور حقیقت آشنا دل کے لئے یہ امر کہ تمدن اور اسلام دودھ شریک بھائی ہیں۔ ایسا ہی یقینی ہے جیسا یہ کہنا کہ کل آفتاب عالمتاب مشرق سے طلوع ہوگا۔ قطع نظر تمدن کے تمام دوسرے شعبوں کے اس جگہ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ طب اور اسلام میں باہم کیا تعلق ہے ؛

علم طب کی غرض ہے (۱) تحفظ صحت حاصلہ (۲) اعادہ صحت زائلہ۔ حکمت کا ایک فقرہ ہے کہ "احتیاط (تحفظ صحت حاصلہ) علاج (اعادہ صحت زائلہ) سے بہتر ہے"۔ ایک حدیث کا مضمون ہے کہ "معدہ بیماری کا گھر اور پرہیز سب دواؤں کی اصل ہے"۔ اس لئے غالباً یہ مناسب ہوگا کہ پہلے حفظان صحت ہی کے اصول بیان کئے جائیں۔ حفظ صحت کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انسان عمر طبعی تک زندہ رہے۔ اور جب تک زندہ رہے تندرستی کے حظایظ و لذایذ سے بہرہ یاب ہو ؎

تندرستی ہزار نعمت ہے قدر اس کی مریض سے پوچھو

انسانی زندگی کی درازی کے بہت سے اسباب ہیں جن کا خلاصہ ایک عالم نے تین لفظوں میں کیا ہے۔ (۱) صفائی (۲) اعتدال (۳) پرہیزگاری

جس شخص کا دماغ صحیح ہے۔ وہ اس امر کے باور کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی تامل نہیں کر سکتا کہ یہ وہ اصول ہیں جن پر صحت کا بالکل دارومدار ہے۔ اور یہ کہنے کے لئے میں کافی سے زیادہ جرأت رکھتا ہوں کہ یہ اصول ان اصول سے کچھ بڑھکر نہیں جو پاک مذہب اسلام نے وضع کئے ہیں جس کا بین ثبوت ان لوگوں کی عمر و صحت ہے جنہوں نے احکام اسلام کی پابندی کی۔

طب اور اسلام کے گاڑھے تعلق کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ بانی اسلام صلعم نے میزان علم میں ایک طرف "علم الابدان" کو رکھا ہے۔ اور دوسری طرف "علم الادیان" کو۔ لیکن دفع دخل مقدر کے لئے ابھی مجھے کچھ اور کہنا ہے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ بنائے اسلام پانچ چیزیں ہیں (۱) اقرار الوہیت و نبوت (۲) نماز (۳) زکوۃ (۴) حج (۵) روزۂ رمضان۔ ان میں پہلی شق عقائد کے متعلق ہے اور تیسری اعمال بدنیہ میں داخل نہیں۔ اس لئے دونوں طبی بحث سے خارج ہیں۔ کیوں کہ طب کا موضوع بدن انسان ہے اور اس مضمون میں صرف اعمال بدنیہ ہی سے بحث ہو سکتی ہے۔ باقی رہے نماز۔ روزہ اور حج۔ ان میں بے شمار طبی فوائد موجود ہیں۔

نماز سے پہلے وضو لازمی چیز ہے۔ اور جب پانچوں وقت وہ تمام اعضا جن پر گرد و غبار پڑنے کا احتمال ہے دُھلتے رہیں گے۔ تو اس کا جو اثر صحت پر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ آں حضرت صلعم گرمی کے موسم میں وضو کا پانی چہرۂ مبارک سے نہیں پونچھتے تھے تاکہ چہرہ پر نمی دیر تک باقی رہے۔ اور فرحت حاصل ہو۔ جاڑوں کے موسم میں اس کے خلاف عمل ہوتا تھا۔ تاکہ سردی سے نقصان نہ پہنچے۔ نماز کی حرکتوں اور مختلف اوقات میں حرکتوں کی کمی بیشی سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ریاضت کا بہت کچھ لحاظ رکھا گیا ہے۔ جس سے فضلات ردیہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کا یقینی ثبوت یہ ہے کہ رمضان شریف میں چونکہ دن بھر کے امساک کے بعد بتقاضائے بشریت رات کے وقت کھانے پینے میں کسی قدر بے اعتدالی کا خوف ہے اس لئے نماز عشا میں تراویح بھی اضافہ کر دی گئیں۔

گیارہ مہینے کی لگاتار محنت کے بعد معدہ کو آرام دینے اور سکون میں لانے کے لئے روزہ نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اس کے بعد وہ اپنے فعل کو اچھی طرح انجام دے سکے۔ بعض خاص صورتوں میں افطار کی اجازت اور قضا کا واجب ہونا ایک بین دلیل اس امر کی ہے کہ روزہ بھی ایک قسم کی ریاضت ہے۔ دیکھئے قدرت کا کھیل کہ جب جانوروں کو اپنے معدہ کی اصلاح منظور ہوتی ہے۔ یا جب وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جس میں کھانا مضر ہو تو وہ جب ضرورت کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ یا کم کر دیتے ہیں ؎

اعتدال قایم رکھنے ہی کی غرض سے رمضان کے بعد چھ روزے مستحسن قرار دئے گئے ہیں۔ روزہ کے مفید ہونے یا غایت ما فی الباب مضر نہ ہونے کی سب سے معتبر ضمانت یہ ہے۔ کہ اس کا وجود مختلف صورتوں کے ساتھ کل مذاہب میں دیکھا جاتا ہے۔ اور تمام انبیائے سابقین اور بہت سے فلاسفر اس کے پابند پائے جاتے ہیں ؎

علاوہ طرح طرح کے تجربوں کے جو سیاحت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر سفر میں کوئی طبی فائدہ موجود ہے۔ اور بالیقین ہے۔ تو حج بھی منافع طبیہ سے خالی نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ مسافرت کا فائدہ مسافت کی مناسبت سے ہو۔ لیکن کم سے کم ادائے مناسک میں تو عربی ہندی ترکی و بلوچی سب برابر ہیں ؎

ایک بلند پایہ محدث اور نہایت مقدس عالم علامہ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں کہ "نماز ایک قسم کی ریاضت ہے۔ جس سے بدن کی صحت قایم رہتی ہے اخلاط اور فضلے تحلیل ہوتے ہیں ..... رات کو عبادت کے لئے کھڑا ہونا بھی من جملہ اسباب حفظان صحت کے ہے ..... روزہ میں بھی حفظ صحت اور بدن اور نفس کی ریاضت مقصود ہے۔ جس کا کوئی صحیح الفطرت شخص انکار نہیں کر سکتا۔ حج کے لئے سفر کرنا بھی حفظان صحت کا باعث ہے" بڑے بڑے مقدس علما ریاضت کی تاکید کرتے ہیں۔ بلکہ سب سے عجیب بات یہ ہے۔ کہ وہ مذہب اسلام کو ایک نظام ریاضت قرار دیتے ہیں ؎

اب میں ان امور کی جانب متوجہ ہوتا ہوں جن کی نسبت کہہ چکا ہوں

کہ یہ انسان کی درازیٔ حیات کے اسباب کا خلاصہ ہیں۔ سب سے پہلے صفائی کو لیجئے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔

ان اللّٰہ یحبّ التوّابین و یحب المتطھرین۔

بیشک خدا توبہ کرنے والوں اور خوب پاک صاف رہنے والوں کو چاہتا ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے

تنظفوا بکل ما استطعتم فان اللّٰہ تعالیٰ بنی الاسلام علی النظافۃ طھروا ھذہ الاجساد طھرتم اللّٰہ

جیسے بنے پاک صاف رہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بنیاد ہی صفائی پر رکھی ہے ان جسموں کو صاف ستھرا رکھو۔ خدا تمہیں پاک کرے گا

بعض لوگ اپنے مکانوں کو میلا کچیلا رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ نے ان سے فرمایا

مالکم لا تنظفون عذراتکم

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ جو اپنے گھروں کو صاف نہیں رکھتے۔

آں حضرت صلعم کا ارشاد ہے۔

ترفع البرکۃ من البیت اذا کانت فیہ الکناسۃ

جب کسی گھر میں کوڑا کرکٹ ہوتا ہے تو اس سے برکت اٹھ جاتی ہے

طھور الطعام یزید فی الطعام والدین والرزق

کھانے کی صفائی کھانے۔ دین اور رزق میں زیادتی کا باعث ہے۔

لا یبیتن احدکم وفی یدہ غمر الطعام فان اصابہ شیٔ فلا یلومن الا نفسہ۔

تم میں سے کوئی شخص ایسی حالت میں نہ سوئے کہ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی چکنائی لگی ہو۔ اور اس کے بعد اگر اسے کچھ نقصان پہنچے تو ہرگز ملامت نہ کرے مگر اپنے ہی آپ کو۔

الفطرۃ خمس الاختتان والاستحداد و قص الشارب وتقلیم الاظفار و نتف الابط

پانچ باتیں عین فطرۃ ہیں ختنہ کرنا استرہ لینا لبیں ترشنا۔ ناخن کاٹنا اور بغلوں کے بال دور کرنا۔

البسوا ثیاب البیض فانها اطہر و طیب	سفید کپڑے پہنا کرو۔ وہی سب سے زیادہ صاف اور اچھے ہوتے ہیں۔
استجدوا النعال فانہا خلاخیل الرجال	نئی نئی جوتیاں پہنا کرو۔ کیونکہ جوتیاں مردوں کا زیور ہیں۔

اعتدال کی نسبت آں حضرت صلعم نے فرمایا ہے۔

یا ایہا الناس علیکم بالقصد علیکم بالقصد۔ علیکم بالقصد	لوگو! میانہ روی اپنے اوپر لازم کر لو (انتہائے تاکید کے لئے تین بار فرمایا)
کلوا فی انصاف البطون	آدھے پیٹ کھایا کرو۔
ان کثرۃ الاکل شؤم	بے شک زیادہ خوری نحوست ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں

ایاکم والبطانۃ فی الطعام والشراب فانہا مفسدۃ للجسد مورثۃ للسقم مکسلۃ عن الصلوۃ وعلیکم بالقصد فیہما فانہ اصلح للجسد وابعد من السرف وان الرجل لن یہلک حتیٰ یوثر شہوتہ علیٰ دینہ۔	کھانے پینے میں زیادتی سے بچو۔ کیونکہ وہ جسم کو بگاڑنے والی بیماری پیدا کرنے والی۔ نماز میں سستی لانے والی ہے۔ اور اعتدال اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ وہ جسم بناتا اور فضول خرچی سے بچاتا ہے۔ اور کوئی شخص جب تک وہ اپنی خواہشوں کو دین پر مقدم نہ کر دے ہلاک نہ ہوگا

جناب امیرؑ کا ارشاد ہے۔

البطنۃ تذہب الفطنۃ	پرخوری تیزی فہم کو کھو دیتی ہے۔

اس بارہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک اور بھی نہایت لطیف ارشاد ہے جس کی نسبت یہ کہنا چاہیے کہ وہ زندگی کا بیمہ ہے

جمیع الطب فی البیتین جمع	وحسن القول فی قصر الکلام
تقلل ان اکلت وبعد اکل	تجنب فالشفاء لفی الخزام
ولیس علی النفوس اشد باسا	من ادخال الطعام علی الطعام
فوارشہ عار مسم ہار	شقاء المرء من اکل الطعام

وساری طب دو بیتوں میں جمع ہے۔ اور بات تو مختصر ہی اچھی ہوتی ہے۔ کھا
تو تھوڑا کھاؤ۔ اور کھانے کے بعد وقفہ کرو کیونکہ تندرستی اسی میں متصور ہے
انسان کے لئے تداخل سے بڑھ کر کوئی چیز تکلیف دہ نہیں۔ اگر ایسا ہو تو بڑی
خرابی ہے اس لئے کہ انسان کی ساری مصیبت کھانے ہی سے ہے،
یہاں تک کہ عبادت میں بھی اعتدال رکھنے کا حکم ہے۔ جس سے
تندرستی میں فرق نہ آنے پائے۔ جب کثرت قیام سے آں حضرت صلعم کے پا
مبارک ورم کرنے لگے تو ارشاد ہوا کہ اتنی سویرے نہ اٹھا کیجئے۔ حدیث شریف
میں آیا ہے۔

علیکم من الاعمال ما تطیقون لا تشددوا علےٰ انفسکم فیشدد علیکم	وہی کام کرو جس کی تم میں طاقت ہے اپنی جانوں پر سختی نہ کرو۔ ورنہ تم پر سختی کی جائے گی۔

پرہیزگاری کے متعلق حضرت ایزد جل شانہٗ کا فرمان ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم	تم میں سب سے زیادہ معزز و محترم اللہ کے نزدیک وہی لوگ ہیں۔ جو پرہیزگاری میں بڑھے ہوئے ہیں

قرآن و حدیث میں مجملاً و مفصلاً تمام افعال قبیحہ سے کلی اجتناب کی سخت
تاکید ہے۔ لیکن اس موقع پر میں صرف امام شافعیؒ کے قول پر اکتفا کروں گا۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی
لان العلم نور من اللہ ونور اللہ لا یعطی لعاصی

(میں نے وکیعؒ سے اپنے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی۔ تو فرمایا کہ گناہوں
توبہ کرو۔ کیونکہ علم خدا تعالیٰ کا ایک نور ہے۔ جو گنہگاروں کو عطا نہیں ہوتا)

اب میں ان چند امور کا ذکر کرتا ہوں۔ جو مذکورہ بالا تینوں اسباب میں
سے کسی ایک کی ذیل میں تو نہیں ہیں۔ لیکن اُن کا تندرستی پر بہت بڑا اثر ہے
حدیث شریف میں سوائے اُن مقاصد کے۔ جن کا ذکر ذیل میں ہے کُتّا
فیشن کے لئے پالنے کی ممانعت ہے ؛

من اتخذ کلبًا الا کلب ماشیۃ او صید او زرع انتقص من اجرہ کل یوم قیراط

جس نے کتا سوائے گلہ کی نگرانی، شکار یا کھیتی باڑی کی حفاظت کے کسی اور غرض کے لئے پالا اس کے ثواب میں سے ہر روز بمقدار ایک قیراط کے کم ہوتا ہے۔

ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ کتے کے منہ کی بھاپ آدمی کے جگر کے لئے سخت مضر ہے۔ گہرا سانس لینے کے فوائد طب جدید سے بخوبی ثابت ہو چکے اور صوفیائے کرام کا طریقہ پاس انفاس بھی اسی اصول پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل امور بھی قابل لحاظ ہیں:۔

آں حضرت صلعم لقمہ ہمیشہ چھوٹا لیتے اور خوب چبا چبا کر کھاتے تھے۔ تمباکو جو سخت مضر صحت شے ہے۔ اس کی کراہت میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ زیادہ گرم و سرد چیزیں کھانی بھی غیر مستحسن قرار دی گئی ہیں۔ آپ کھانے پینے کی چیز کو پھونک سے کبھی ٹھنڈا نہیں کرتے تھے۔ پانی خصوصاً پینے کے پانی اور کھانے پینے کی دوسری اشیا کے ڈھک کر رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ قیلولہ یعنی دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹنا ایک مسنون فعل ہے۔ یورپ کے ڈاکٹر اور دوسرے بڑے بڑے لوگ بھی اس کے فوائد کے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض یورپین ممالک میں دوپہر کا سونا رسماً جاری ہے۔

بقول اخبار النصیحت (تونس) جرمنی کا ایک مشہور ڈاکٹر کوخ لکھتا ہے کہ "جس وقت سے مجھ کو نوشادر کا دار الکلب کے لئے تیر بہدف علاج ہونا دریافت ہو گیا ہے۔ اُس وقت سے میں اُس عظیم الشان نبی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاص طور پر قدر و منزلت کرتا ہوں۔ اس انکشاف کی راہ میں مجھ کو انھی کے مبارک قول کی شمع نور بیز نے روشنی دکھائی۔ میں نے اُن کی وہ حدیث پڑھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس برتن میں کتا منہ ڈالے اس کو سات بار دھو ڈالو چھ مرتبہ پانی سے اور ایک دفعہ مٹی سے۔ یہ حدیث دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے عظیم الشان پیغمبر کی شان فضول گوئی نہیں ہو سکتی ضرور

اس میں کوئی مفید راز ہے۔ پس میں نے مٹی کے عنصروں کی کیمیاوی تحلیل کر کے ہر ایک عنصر کا دارالکلب میں الگ الگ استعمال شروع کیا۔ اخیر میں نوشادر کے تجربہ کی نوبت آتے ہی مجھ پر منکشف ہو گیا۔ کہ اس مرض کا یہی علاج ہے۔ آں حضرتؐ نے مٹی سے برتن دھونے کی رغبت کیوں دلائی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوشادر ہمیشہ مٹی میں موجود رہتا ہے۔ اور اگر آپ نے محض نوشادر ہی سے برتن دھونے کی ہدایت فرائی ہوتی۔ تو بسا اوقات اُس کا ملنا غیر ممکن ہوتا۔ اس لئے مٹی جو ہر وقت اور ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ برتنوں کی صفائی کے لئے بہترین ذریعہ تھی۔ اسی طرح آں حضرت صلعم کی حدیث الحمی من فیح جہنم فاطفؤا حرھا بالماء پر اطبا ہنسا کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کی غرض اس ارشاد سے یہ تھی۔ کہ صفراوی بخار کا علاج آب سرد سے کرو۔ چنانچہ اب تحقیقات نے واضح کر دیا ہے۔ کہ بخار کا علاج ٹھنڈا پانی ہی نہیں۔ بلکہ برف آب ہے۔ غرضکہ آں حضرت کی بہت سی حدیثیں فن طب کی جان اور اصل الاصول ہیں۔ اور تحقیق و تفتیش اُن کی صداقت کاملہ کا اظہار کرتی ہے میں اس جلیل القدر پیغمبر کا ادب و احترام کرتا اور کہتا ہوں کہ ابتدائے آفرینش آدم سے اب تک کوئی طبیب و حکیم دنیا میں آپ کا ہم پلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اللھم صلی علی محمد و بارک وسلم؛

راقم نے امریکہ کے کسی رسالہ میں ایک مضمون دیکھا تھا جس میں خود نہایت معمر لوگوں کی شہادت کی بنا پر ثابت کیا گیا تھا۔ کہ انسانی زندگی اور تندرستی پر موت کے خیال کا اثر ضرور خراب پڑتا ہے۔ کتابوں میں کثرت سے ایسی حدیثیں مذکور ہیں جن سے موت کی تمنا نہ کرنے اور طوالت عمر کی خواہش کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔

لا یتمنی احدکم الموت من ضر اصابہ فان کان لا بد فاعلاً فلیقل اللھم احینی ما کانت الحیوٰۃ خیرا لی و توفنی اذا کانت الوفات خیرا لی	اگر تم میں سے کسی پر کوئی مصیبت پڑے تو وہ موت کی آرزو ہرگز نہ کرے۔ اور اگر یہ آرزو کرنی ہی پڑے تو یہ کہے کہ یا اللہ جتنا زندگی میرے لئے اچھی ہو مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے موت اچھی ہو تو موت دے؛

لا یتمنی احدکم الموت اما محسنا فلعلہ ان یزداد خیرًا و اما مسیئا فلعلہ ان یستعتب	تم میں سے کوئی موت کی تمنا ہرگز نہ کرے چاہے وہ نکوکار ہو۔ کیونکہ شاید اور زیادہ نیکی کرے۔ اور چاہے خطاکار ہو۔ کیونکہ شاید تائب ہو جائے۔
خیارکم اطولکم اعمارا واحسنکم اعمالا۔	تم میں اچھے وہی ہیں جن کی عمریں نسبتہً طویل اور اعمال عمدہ ہیں۔
ان اللہ یحب ابناء الثمانین۔	بے شک اللہ ۸۰ برس کی عمر والوں کو دوست رکھتا ہے۔

کھڑے ہو کر یا لیٹ کر کچھ کھانا پینا طبًا ممنوع ہے۔ یہی حکم اسلام کا ہے

لا اکل متکئا میں تکیہ لگا کر نہیں کھاتا۔

لا یشربن احد منکم قائما تم میں کوئی کھڑا ہو کر کچھ نہ پیئے۔

دار قطنی نے حضرت عمر ابن خطاب سے روایت کی ہے کہ فرمایا حضرت صلعم نے **لا تغتسلوا بالماء الشمس فانہ یورث البرص** دھوپ کے پانی سے نہ نہاؤ کیونکہ وہ کوڑھ پیدا کرتا ہے۔

اطبا سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یورک ایسڈ و پیشاب کا تیزاب کیسی بری بلا ہے۔ خصوصاً جب قطع بول کیا جائے۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ مع رسول اللہ صلعم مسجد میں تھے۔ کہ ایک گنوار آیا اور مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ اصحاب رسول صلعم پکارنے لگے "یہ کیا ہے یہ کیا ہے" لیکن آپ نے فرمایا

لا تزرموہ دعوہ یعنی اس کا پیشاب نہ روکو بلکہ اسے بول لینے دو۔

پس اصحاب نے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس نے پیشاب کر لیا الخ۔

حدیث شریف میں دواؤں کے منافع بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ شہد کی نسبت فرمایا ہے۔ **فیہ شفاء للناس** یعنی اس میں (شہد میں) لوگوں کے لئے شفا موجود ہے۔ اور شہد کے متعلق ایسا ہی قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔

کھمبی کے متعلق ارشاد ہے۔ کہ یہ شفا ہے آنکھوں کے واسطے۔ فرطست یا رسول
اللہ روحی فداک۔

میرے مضمون کے اس حصہ کی نسبت چند باتیں لحاظ کے قابل ہیں۔
(الف) میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ورنہ فی نفسہ
مضمون ایسا وسیع ہے کہ ایک عمر طبعی کا نہایت دلچسپ مشغلہ ہو سکتا ہے۔ (ب)
تمام ان امور کے بیان کرنے سے دانستہ احتراز کیا ہے۔ جن کی جھلک کسی دین
مذہب میں بھی پائی جاتی ہے (ج) حتی الامکان ایسا مواد جمع کرنے سے
کیا ہے۔ جو ناظرین کے نزد حاتی معدہ میں ناگوار گرانی پیدا کرے۔

یہاں سے اعادہ صحت زائلہ کے متعلق مضمون کا دوسرا اور تاریخی حصہ شروع
ہوتا ہے جس میں مجھے معتبر تاریخی شہادت کے رو سے بتانا چاہئے۔ کہ مسلمانو
نے اس کے واسطے کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ مسلمانوں کے طبی کارناموں کی نسبت
علامہ شبلی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور میں اپنے فرض سے بخوبی سبکدوش ہوتا
ہوں۔ اگر صرف ان کی تصانیف کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو رہوں کہ
بحکم ما لا یدرک کلہ لا یترک جلہ صرف اُن چند چیدہ اور خاص الخاص واقعات
اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں جنہیں ہماری مشتاق آنکھیں اس کچھ
حق نما اور کچھ کذب و افترا کے زمانہ میں بھی تلاش کرتی ہیں۔

سب سے پہلے جن فن کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ وہ طب کی ہی اور
تھیں۔ جو امیر معاویہؓ کے حکم سے ایک عیسائی طبیب ابن آثال نے یونانی سے
منتقل کیں اس کے بعد جو سیلاب نئے نئے علوم و فنون کا عربی میں خواہش
نتیجہ یہ ہوا کہ مقتدی مبتدیوں سے گوئے سبقت لے گئے۔ سب
قوم نے شفاخانوں کا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ مسلمان ہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر بڑے
اپنے اپنے مکانوں پر علاج کرتے تھے۔ ولید بن عبدالملک ہرگز نہ کرے۔ اور اگر
اور مفلوجوں کا وظیفہ اور ہر ایک کی خدمت سے تو یہ کہے کہ یا اللہ جنتک
مقرر کر رکھا تھا۔ کوڑھیوں کے لئے علاوہ وظیفہ کے یہ ... زندہ رکھ اور ... نہیں
پائیں۔ بڑے بڑے نامور اطبا شفاخانوں میں بالکل معمولی صورت ...

اگرچہ پہلا شفاخانہ سنہ ھ میں تعمیر ہوا تھا لیکن چند ہی سال کے بعد خلیفہ ہارون (سنہ ۱۷۰ تا ۱۹۳ھ) کے عہد میں شفاخانوں کا محکمہ بالکل مکمل ہو گیا۔ احمد بن طولون گورنر مصر کے شفاخانے میں جب کوئی مریض داخل ہوتا۔ تو اس کا مال و اسباب شفاخانے کے خزانچی کے پاس داخل ہو کر اُسے نئے کپڑے اور بچھونے دیئے جاتے تھے۔ ہر جمعہ کو گورنر شفاخانہ کا معائنہ اور بیماروں کا استفسار حال کرتا تھا۔ اسی احمد بن طولون کی طرف سے جامع مسجد کے ایک گوشہ میں ایک کمرہ تھا۔ جس میں دوائیں موجود رہتی تھیں۔ اور ایک طبیب جمعہ کے دن اس میں نماز کے اول وقت سے آخر تک بیٹھتا تھا۔ تاکہ دوران نماز میں اگر کسی کو کوئی شکایت ہو۔ تو اس کا علاج کرے۔ خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد میں جیل خانوں کے علاج کے لئے اطبا مخصوص کئے گئے۔ بہت سے طبیبوں کا صرف یہ کام تھا۔ کہ دیہات میں دورہ کر کے بیماروں کا علاج کریں۔ ان طبیبوں کے ساتھ مختصر سا دواخانہ بھی ہوتا تھا۔ عورتوں اور پاگلوں کے علاج کا بھی اچھا انتظام تھا۔ ان مسافر اور اجنبی لوگوں کے لئے جو شفاخانہ جانے میں کسر شان خیال کرتے تھے۔ جدا طبیب تھے اور مریضوں کی فرودگاہوں پر جا کر علاج کرتے تھے۔ ملک منصور قلاؤن کے شفاخانہ کی نسبت علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ اس میں "ایک خاص التزام یہ تھا ہر مرض کے لئے جدا جدا کمرے تھے ...... ان تمام کمروں میں نہر کے ذریعہ سے پانی آتا تھا اور ہر وقت پانی کی جدولیں جاری رہتی تھیں" عمدہ سے عمدہ دوائیں بہم پہنچانے کی نسبت علامہ ممدوح فرماتے ہیں۔ کہ "شفاخانوں کے لئے عمدہ دواؤں کے بہم پہنچانے کا نہایت اہتمام تھا۔ عطار جو دوائیں بیچتے ان کی جانچ اور امتحان کے لئے خاص محکمہ تھا۔ جس کے افسر کا لقب "رئیس العشابین" ہوتا تھا اس عہدہ پر ہمیشہ وہ اطبا مقرر ہوتے تھے۔ جو نباتات میں کمال رکھتے تھے"

یہ تو ظاہر ہے تھوڑا سا نمونہ اس کا جو ہمیں کرنا چاہیئے۔ مگر نہیں کرتے۔ اور ... اب نہیں کر سکتے ؎

اذا فخرت بآباء مضوا سلفا قلنا صدقت ولکن بئس ما ولدوا

(روزنامہ پیسہ اخبار ۱۵ و ۱۶ نومبر ۱۹۱۸ء)

۵۰
تاریخ عالم کے پہلے تین دَور

اگرچہ یہ سوال کہ انسان اور زمین میں کس کی آفرینش مقدم ہے بادی النظر میں ایسا ہی پیچیدہ ہے۔ جیسا کہ مرغی اور انڈے کا۔ لیکن مذہب اور سائنس کا اس پر پورا اتفاق ہے۔ کہ جب زمین مخلوق ہوئی ہے۔ تو انسان کا وجود صرف خدا کے علم میں تھا۔ بائبل مقدس کا پہلا جملہ یہ ہے "کہ ابتدا میں خدا نے زمین آسمان پیدا کئے۔" اس کے بعد دیگر موجودات عالم کا ذکر ہے۔ اور انسان کی تخلیق کا بیان سب سے پیچھے ہے۔ قرآن شریف میں ہے۔ کہ خدا نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین پر اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں۔" گویا "خلیفۃ اللہ" سے پہلے "ارض اللہ" موجود تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال نہایت دلچسپ ہے کہ "دھرتی ماتا" کی جس پر اب ہم رہتے سہتے اور جس پر کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ باوا آدمؑ اور اماں حواؑ سے پہلے کیا حالت تھی؟

کچھ شک نہیں کہ کرۂ ارض کی ابتدائی تاریخ نہ صرف دلچسپ بلکہ نہایت عجیب و غریب ہے۔ پیدا ہونے کے وقت سے اس میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور قبل اس کے کہ اس پر انسان کا نزول ہو۔ وہ اس کے خیر مقدم کے لئے لاکھوں برس پہلے سے تیار ہو رہی تھی۔

اب غور کرنا چاہئے۔ کہ زمین پیدا کس طرح ہوئی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ سڑک پر کیچڑ ہو اور گاڑی اس پر تیزی سے چلے۔ تو کیچڑ پہیوں سے چپٹی اور پھر اُوچٹ اُوچٹ کر دور دور تک جاتی ہے۔ اس طرح گردش کرتے وقت آفتاب کے عظیم جرم سے جو آتشیں ٹکڑے جدا ہوئے۔ انھی کے باہمی اتصال سے ہماری زمین اور دوسرے سیارے بنے اور سورج کے گرد فضائے بسیط میں بے تحاشا گھومنے لگے۔ خداوند تعالٰے نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ "آسمانوں اور زمین کا ایک بھنڈا سا تھا۔ سو ہم نے توڑ کر الگ الگ کر دیا۔" زمین اپنی ابتدائی حالت میں بالکل ایک کرۂ نار تھی۔ مگر جوں جوں وہ جس تیزی سے

دوڑتی ہے۔ اس لئے یہ حالت قایم نہ رہنے دہی۔ اور زمین کی بالائی سطح ٹھنڈی ہو کر نباتی و حیوانی زندگی کے قابل ہو گئی ٭

قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ نباتات کا وجود حیوانات سے مقدم ہے۔ اس زمانہ کو پرایم آرڈیل ایج یا عہد مقدم الترتیب کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کے پودوں میں پتے۔ اور بیج کی کہریاں نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی اصلی ساخت کا حال متیقن طور پر معلوم نہیں۔ مختلف قسم کے مونگے کثرت سے تھے۔ اور جناب تو بہ تو بننے لگی تھیں۔ دریا میں حیوانات کثرت سے تھے مگر درندے پرندے۔ کیڑے مکوڑے۔ اور مچھلیاں نہ تھیں۔ اس وقت تک ریڑھ کی ہڈی والے حیوانات بھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ دریائی جانور بعض کیکڑوں اور بعض جھینگوں کے مشابہ تھے۔ کچھ جانور ٹین کی گھنڈی سے بھی چھوٹے تھے
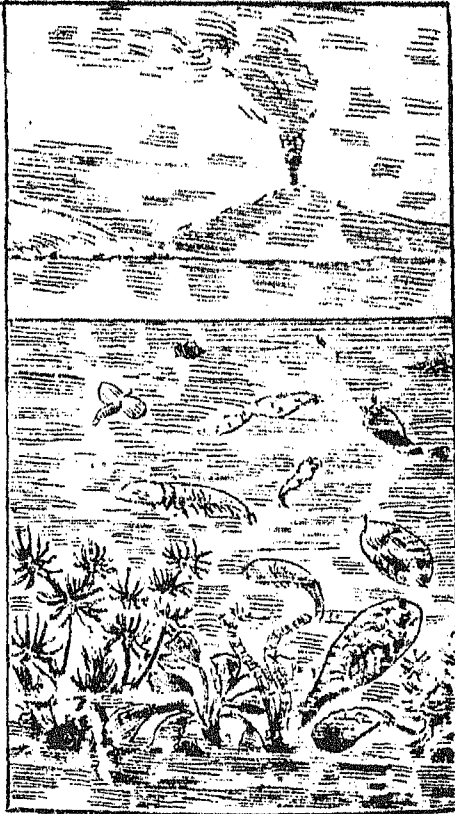
عہد مقدم الترتیب کی حیوانی و نباتی زندگی کا نمونہ

بہت سے جانوروں کے سروں پر چوڑا چپٹا نعل سا خول چڑھا ہوتا تھا جس کی غایت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ ان سے سمندر کا ریت ہٹا کر اس میں چھپ رہتے تھے ٭

اس کے بعد بے شمار قرن گزرنے پر ایک اور دور شروع ہوا جس کا نام مڈل لائف پیرڈ عہد حیات وسطی ہے۔ اور جو عظیم الجثہ حشرات الارض مچھلیوں عجیب و

عجیب پرندوں اور دیگر حیوانات کے سبب سے ممتاز ہے۔اس زمانہ میں ایک جانور مچھلی اور چھپکلی دونوں کے مشابہ ہوتا تھا۔سر چھپکلی اور دھڑ ویل مچھلی کا سا ہوتا تھا۔چار پاؤں اور دم بھی تھی۔طول ۳۰ فٹ۔جبڑے لمبان میں ۶ فٹ آنکھیں آدمی کے سر سے بڑی دانت گھڑیال کے سے تعداد میں ۲۰۰۔آنکھوں کے گرد ہڈی کے حلقے۔بلی کی طرح اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے تھے۔اس جانور کو ماہی نما چھپکلی کہیں۔تو بالکل موزوں ہے۔اسی قبیل کے اور بھی جانور تھے۔جن کا طول ۸۰ فٹ تک ہوتا تھا۔ان کی بسر اوقات پھلاڑی سبزیوں پر تھی۔ پردار چھپکلیاں چڑیوں کی طرح اڑتی پھرتی تھیں ؛

عہد حیات وسطی کی حیوانی و نباتی زندگی کا نمونہ

اس کے بعد ٹرشیری پیریڈ یا عہد ثالث کا آغاز ہوا جس میں زمین پر بڑے بڑے انقلاب ہوئے۔اس وقت زمین کی سطح سمندر سے بلند ہونی شروع ہوئی۔جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف آب و ہوا مختلف ہو گئی۔بلکہ خشکی کے پودے اور جانور بھی پیدا ہونے لگے۔پھر بھی جن حصوں پر آج بڑی بڑی آبادیاں ہیں۔وہ سب تہ آب تھے خشکی کے حیوانات میں ایک جانور ہاتھی سے بھی بڑا ہوتا اور میٹھے پانی کی جھیلوں یا بڑے بڑے دریاؤں کے دہانوں میں رہتا تھا۔ہاتھی کی طرح اس کے بھی بڑے بڑے دانت ہوتے تھے مگر سینہ کی طرف مڑے ہوئے۔بجارہ سونڈ
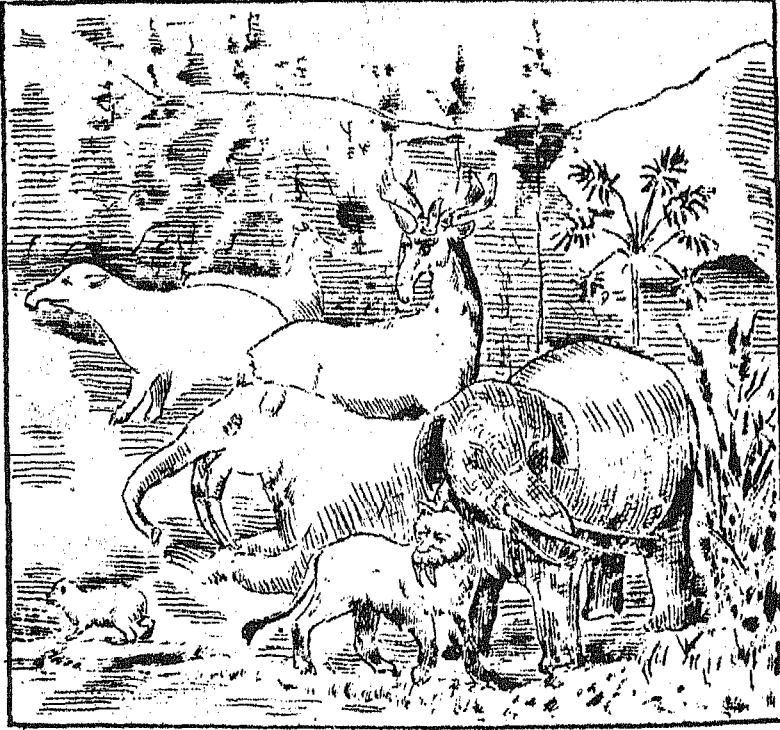
عہد ثالث کی حیوانی و نباتی زندگی کا نمونہ

کے ذریعہ منہ تک پہنچاتا تھا۔ بارہ سنگے ہاتھی کی برابر بڑے ہوتے تھے۔ آج کل ہاتھی کی صرف دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستانی اور افریقیائی۔ مگر ہمالیہ کے دامن میں کوہ سوالک پر سات قسم کے ڈہانچ نکلے ہیں۔ ایک قسم کے ہاتھی کے دانت ۱۰½ فٹ طویل اور جڑ پہ دور میں ۲۶ انچہ ہوتے تھے۔ سوالک پر ۱۸ فٹ سے زیادہ لمبے ۵ فٹ چوڑے اور ۷ فٹ سے زیادہ اونچے کچھووں کے ڈہانچ بھی ملے ہیں اس کے بعد رفتہ رفتہ زمین نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ اور وہ اس قابل ہوگئی۔ کہ اشرف المخلوقات اور خدا کی قدرت کا کامل نمونہ انسان اس پر رہ کر اپنے خالق کی کاریگریوں پر غور اور اس کے نام کی تقدیس کر سکے۔ (فصیح الملک اپریل سنہ ۱۹۰۶ء)

۵۱

کیا ثوابت ساکن ہیں؟

اب گرمیوں کے دن ہیں۔ سب نکل نکل کر باہر سوتے ہیں۔ اپنی عمر میں آپ نے بارہا تجربہ کیا ہوگا کہ جب کبھی اس موسم میں رات کو آنکھ کھل گئی ہے تو نیلے آسمان پر روشن ستاروں کو دیکھ کر آپ دنگ رہ گئے ہیں۔ اور روحانی خیالات کے تواتر سے آپ کا دم گھٹنے لگا ہے۔ یاد رکھیے آپ سے زیادہ محو حیرت وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان خدائی چراغوں کے مطالعہ میں راتیں آنکھوں میں تیر کرتے ہیں؟

ہر زمانے میں ایک کثیر التعداد گروہ کا خیال رہا ہے۔ کہ سائنس سے مذہبی عقائد میں انتشار آجاتا ہے۔ اگرچہ میں اس خیال کی تردید کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ کیونکہ عام طبایع کا رجحان واقعی ایسا ہی ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ یہ الزام سائنس کی اس شق کے متعلق جسے ہیئت کہتے ہیں ۔ خصوصیت کے ساتھ بے بنیاد ہے۔ اس علم کا ماہر جب دوربین ہاتھ میں لے کر اوپر کی طرف دیکھتا ہے۔ تو خدا کی عظمت کا گہرا نقش اس کے دل پر ہو جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔ کہ سائنس کے اندر وہ کون سا مفسد مادہ ہے۔ جو انسان کے دماغ کے اندر ایک غیر معمولی غلیان پیدا کرتا ہے۔ نیوٹن با ایں ہمہ تبحر معترف ہے کہ خدائے تعالےٰ کی لامتناہی قدرت کے مقابلے میں میری حیثیت اس بچے سے زیادہ نہیں ہے۔ جو کسی ناپیداکنار بحر زخار کے کنارے بیٹھا خزف ریزوں سے کھیل رہا ہو۔ درحقیقت علوم عقلیہ کی اور کوئی شاخ ہیئت سے بڑھ کر تزکیہ نفس نہیں کر سکتی۔ ہیئت دان وبالنجم ھم یھتدون کے پورے مصداق ہوتے ہیں اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ ستاروں کے محض محسوس منظر ہونے کے سبب سے انسان کو اپنے توہمات کو کام میں لانے کا بہت زیادہ موقع نہیں ملتا۔

قدیم علمائے ہیئت کا خیال تھا کہ ستارے آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں اور ستاروں کی حرکت آسمانوں کی حرکت کے تابع ہے لیکن بعض ستارے انہیں ایسے نظر آئے جو سالہا سال کے مطالعہ کے بعد بھی حرکت کرتے نہ معلوم

ہوئے اِس سے اُنہوں نے قیاس کیا کہ خود آسمان جس میں وہ جڑے ہوئے ہیں ساکن ہے۔ بخلاف اس کے جدید تحقیقات سے ایسا ثابت ہوتا ہے کہ یہ ثوابت یا غیر متحرک ستارے درحقیقت ساکن نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے حیرت انگیز بعد کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں قولوں میں کچھ بھونڈی سی تطبیق ہوسکتی ہے۔ تو اس طرح ہوسکتی ہے کہ حکمائے قدیم جو ان کو آٹھویں آسمان پر مانتے ہیں۔ اس کا یہی مطلب ہے۔ کہ یہ سب ستاروں سے اونچے ہیں۔ کیونکہ سیاروں کی حد صرف ساتویں آسمان تک ہے۔ اور فلک الثوابت سے اوپر جو آسمان ہے اس پر کوئی ستارہ نہیں۔ اسی باعث اس کا نام فلک اطلس ہے۔ کیونکہ اطلس درم بے سکہ کو کہتے ہیں۔ پس جس طرح درم بے سکہ نقوش سے معرّیٰ ہوتا ہے یہ بھی ستاروں سے خالی ہے۔ بہرحال حرکت کے مسئلے سے قطع نظر قدیم وجدید ہیئت ان کے عجیب و غریب بُعد پر یک زبان ہے؛

اِس تصور سے سر چکرانے لگتا ہے۔ کہ جو ثابتہ سب سے قریب ہے وہ بھی ہم سے تقریباً ۲۰ کھرب میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہم ایک دو تین سے لے کر سو فی منٹ کے حساب سے گننا شروع کریں اور لگاتار دن رات گنتے رہیں تو ۲۰ کھرب تک گننے ہی میں تقریباً ۴۰ ہزار سال صرف ہونگے اور لیجئے روشنی ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار رکھتی ہے۔ اور ایک سکنڈ میں زمین کے گرد تقریباً ۷½ بار گھوم سکتی ہے۔ اور آفتاب سے ہم تک تقریباً آٹھ منٹ میں آجاتی ہے۔ مگر ۲۰ کھرب میل تقریباً ۳½ سال میں طے کرے گی۔ یاد رہے کہ یہ فاصلہ اس قدر طویل ہے۔ لیکن اُن ثوابت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جن کی روشنی زمین تک ہزاروں سال میں پہنچی ہے۔

فاصلے کے بعد جب ہم ان کی جسامت کا خیال کرتے ہیں۔ تو خدا ہی یاد آتا ہے۔ دیکھنے میں کوئی ستارہ کم کوئی زیادہ روشن معلوم ہوتا ہے۔ اِس کی ہیئت یہی وجہ نہیں ہوتی کہ جو زیادہ چمکدار ہے۔ وہ قریب بھی زیادہ ہے یا حجم میں بھی بڑا ہے۔ بلکہ ایسے ستارے بھی ہیں۔ جو نہ فاصلہ میں کم ہیں نہ حجم میں بڑے ہیں۔ پھر بھی چمکتے زیادہ ہیں۔ اگرچہ ثوابت کے حجم کے اندازہ کرنے کا

ابھی تک کوئی درست طریقہ دریافت نہیں ہوا لیکن یہ فرض کر کے کہ ان کی روشنی بھی سورج کی روشنی کے برابر ہے۔ جب تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ تو قیاس ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض آفتاب سے کہیں بڑے ہیں۔ چنانچہ سیر لیس نامی ایک ثابتہ کی نسبت لکھا ہے کہ اس کا جرم آفتاب کے جرم سے ۲ ہزار ۷ سو گنا ہے ۔

بہت سے ستاروں کی یہ بھی خصوصیت ہے۔ کہ ان کی روشنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ وہی ستارے جو ابھی ابھی ہماری آنکھوں کو چوندھیائے دیتے تھے دیکھتے دیکھتے دھندلے پڑ گئے۔ بعض کی چمک اور دھندلاہٹ ایک معینہ وقت کی پابند ہوتی ہے۔ اس کی شافی وجہ علما کی سمجھ میں ہنوز ذرا بھی نہیں آئی۔ جب ان ستاروں کی غیر معمولی تیز روشنی کو دوربین کے ذریعہ سے دیکھا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا ہے کہ یہ ہائڈروجن گیس کا بھبوکا ہے۔ جو کسی سخت حادثے سے پیدا ہوا ہے اور یہ حادثہ اپنی نوعیت میں ایسا خوفناک ہے۔ کہ اگر دست بخیر ہمارے سورج ویتا پر گزرے تو یقیناً وہ اور اس کے تابع سارے سیارے آناً فاناً تہ و بالا ہو جائیں۔ اب اس ہائڈروجن گیس کی نسبت دو سلطے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خود اس ستارے میں سے نکلتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی اور ستارے کے ساتھ تصادم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔

ایک بات اور بھی ہے کہ سب ستاروں کی روشنی ایک ہی رنگ کی نہیں ہوتی۔ بعض سرخ بعض نیلے اور بعض تقریباً سب رنگے ہوتے ہیں۔ بہت سے ستارے جو معمولی طور پر ایک دکھائی دیتے ہیں۔ اصل میں دو یا اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں ۔

جھرمٹے ستاروں کی نسبت قیاس کیا گیا ہے۔ کہ یہ کسی مشترک مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔ اور کشش ثقل کے قانون کے پابند ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ لازمی نہیں کہ سب کے سب متحد الاول بھی ہوں۔ بلکہ اکثر مختلف رنگ ہی کے ہوتے ہیں۔ اگر ان ستاروں کے گرد اور ستارے گھومتے ہیں۔ اور وہ آباد بھی ہیں تو روشنی کے عجیب عجیب نظارے وہاں کے باشندوں کے دیکھنے میں آتے ہونگے۔ کبھی تو سارے میں سرخ سی سرخ رنگ ہو جاتا ہوگا۔ اور کبھی نیلا ہی نیلا۔ ان کی حرکت نہائت تیز ہوتی ہے۔ اور۔ ثوابت کی تعداد اگر خالی آنکھ سے دیکھی جائے۔ تو

زیادہ سے زیادہ صرف چند ہزار تک محدود ہے لیکن اگر ہم دوربین کی مدد سے گننے لگیں۔ تو ان کا شمار بیسیوں لاکھ تک پہنچتا ہے۔ اور جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر واحد ایک مشتعل سورج اور ہمارے ذریعہ حرارت و نور سے کہیں بڑا ہے اور اس سے ایسے قدرتی عجائبات ظہور میں آئے ہیں۔ جن کی مثال ہمارے نظام شمسی میں نہیں پائی جاتی۔ تو بے اختیار اس قادر مطلق کی تعریف منہ سے نکل جاتی ہے۔ جس نے ستارے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ لوگ اُن سے ہدایت پائیں۔" (فصیح الملک جون ۱۹۰۶ء)

۵۴

امریکہ کی وجہ تسمیہ

اگرچہ عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے۔ کہ کولمبس کے دریافت کرنے سے پہلے مشرقی نصف کرہ کے باشندوں کو مغربی نصف کرہ کا علم نہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرانی دنیا والے نئی دنیا کے وجود سے اس سے بہت پیشتر سے واقف تھے۔ آئسلینڈ کی پرانی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دسویں صدی عیسوی میں گرینلینڈ کو نارمن قوم نے آباد کر لیا تھا۔ اور تقریباً ۱۰۰۰ء میں اسکینڈینیویا کے دریائی ڈاکوؤں کے ایک سردار لیف ایرکسن نے نیوبیڈفرڈ کے قریب امریکہ کے ساحل کی تحقیقات کر کے ونلینڈ نامی (ونلینڈ کے لغوی معنی انگورستان ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں خودرو انگور کثرت سے پیدا ہوتے تھے) ایک نوآبادی قایم کی۔ یہ معلوم کر کے کہ آبنائے بہرنگ جو ایشیا اور امریکہ کے مابین حد فاصل ہے۔ صرف ۳۶ میل عریض ہے۔ ایشیا والوں کا یہ فخر کہ ہمیں امریکہ کا علم کولمبس سے بہت پہلے سے تھا۔ بالکل خلاف قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ امریکہ کی دریافت نہایت تدریجی تھی۔ ہاں "گورے" اور "سرخ" انسانوں کے باہمی تعلقات کی تاریخ ۱۴۹۲ء ہی ہے۔ اور اسی وجہ سے امریکہ کی دریافت کو عام طور پر کولمبس سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اب ایک اور سوال یہ ہے کہ کولمبس کے دریافت کرنے سے پہلے "مغربی نصف کرہ" یا "نئی دنیا" یا "امریکہ" کا نام کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ اگر اس کا قدیم نام امریکہ نہیں۔ تو امریکہ کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

پہلے سوال کا جواب قطعی طور پر کچھ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ دوسرے کے متعلق میں اس مضمون میں کچھ عرض کروں گا۔

چوں کہ امریکہ کا دریافت کرنے والا کولمبس فرض کیا گیا ہے۔ اس لئے بہت زیادہ قرین قیاس یہ امر تھا کہ اسے کولمبس کی نسبت سے "کولمبیا" کہا جاتا لیکن قضائے الٰہی یہ تھی کہ نئی دنیا کے نام کے ساتھ ایک اطالی الاصل جہازراں امیریگو ویسپوسی کا نام یاد رکھا جائے اور ایسا ہی ہوا۔

کولمبس سے تو اب اسکولوں کے معمولی طالب علم تک واقف ہو گئے ہیں۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس کا تاریخی حال کتابوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ اور اس کے بیٹے فرڈیننڈ کولمبس اور اس کے دوست لاس کاسس نے اس کے حالات لکھے ہیں۔ خود کولمبس نے ۔۔ سے زیادہ خطوط اور رپورٹیں اپنے متعلق لکھی ہیں۔ جن میں ۲۳ خاص اس کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ تمام کاغذات یورپ میں شایع ہوئے ہیں۔ بخلاف اس کے حالات تو درکنار۔ امیریگو ویسپوسی کے نام تک سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض کرنا غالباً ناظرین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا؟

امیریگو ویسپوسی اٹلی کے قدیم شہر فلارنس میں ۱۴۵۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہاں ایک گرجا میں پلاستر کے اوپر اس کی تصویر بھی کھودی ہوئی تھی۔ اس پر ۱۶۱۶ء میں سفیدی کر دی گئی۔ مگر ۱۸۹۸ء میں اس کو پھر صاف کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ امیریگو کا قد میانہ۔ جسم مضبوط اور کسی قدر گٹھیلا تھا۔ ناک طوطی منقار۔ اور رنگت زیتونی تھی۔ بال اور آنکھیں سیاہ۔ چہرے سے استقلال اور متانت عیاں۔ اس کا نام قدیم جرمن لفظ "املرک" کی ایک شکل ہے جس کے معنی "مستقل مزاج" ہیں۔ وہ نہایت حلیم اور ذکی تھا۔ اور کھیل کود کا بھی شائق تھا اس سے بڑے دو بھائی اور تھے۔ ایک وقت میں اس کے خاندان میں دولت

بھی رہ چکی تھی۔ اس نے تعلیم اپنے چچا سے پائی تھی جو رہبان تھا۔

امیریگو کو شروع ہی سے نیچرل فلاسفی ہیئت اور جغرافیہ کا نہایت شوق تھا۔ اس زمانے میں ان علوم کی قدر ان کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے بہت تھی طول البلد اور عرض البلد دریافت کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر تقریباً ۴۰ سال کی عمر تک وہ گمنامی میں پڑا رہا۔ فرصت کے وقت جغرافیے کا مطالعہ کیا کرتا۔ اور اسی دھن میں کثیر التعداد نقشے اور گلوب جمع کر لئے تھے۔ یہاں تک کہ خود بھی نہایت اعلےٰ درجے کے نقشے تیار کرنے لگا تھا۔ ۱۴۹۰ء میں وہ اپنے ملک کی طرف سے اسپین کو کسی خفیہ مشن پر گیا۔ چند سال کے بعد بمقام سیول (اسپین) ایک بہت بڑا کارخانہ اس کے سپرد کر دیا گیا۔ اور چوں کہ ۱۴۹۳ء میں کولمبس اپنی دوسری مہم پر اسی کارخانے کے اہتمام سے گیا تھا اس لئے کولمبس اور امیریگو کی باہم شناسائی بھی ہو گئی۔ اور اس کے بعد سے ان کے تعلقات ہمیشہ نہایت دوستانہ رہے۔

کولمبس کی بحری تحقیقات کی کامیابیوں سے امیریگو کے دل میں بھی ایک جوش پیدا ہوا۔ اور وہ بھی کاروبار چھوڑ کر ۱۴۹۷ء میں امیرالبحر ہوجیڈا کی مہم کے ساتھ کیڈیز کو روانہ ہو گیا۔ اس مہم نے خلیج پیریا کی چھان بین کی اور جنوبی امریکہ کے کنارے کنارے تقریباً سو میل تک چلی گئی۔ اس کا دوسرا سفر امیرالبحر پنیزن کے ساتھ ہوا اور اس دفعہ اس نے خلیج میکسیکو کے چھوٹے چھوٹے جزیزوں کو معلوم کر لیا۔ اس کے بعد پرتگال کے شاہ عمانوئل نے اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ اور ۱۵۰۱ء میں اس نے دو سفر پرتگالی جہازوں پر کئے۔ اس مرتبہ اس کا بیڑہ طوفان میں آ گیا اور چھ میں سے ایک جہاز غرق بھی ہو گیا۔ اس وقت اس نے ساحل برازیل پر خلیج "جملاؤلیا" میں پناہ لی۔ سفر سے پہلے شاہ عمانوئل نے امیریگو سے بڑے بڑے وعدے کئے تھے۔ مگر ایک بھی وفا نہ کیا۔ ۱۵۰۸ء میں امیریگو اسپین آ کر جہازرانی اور ہیئت میں مانجھیوں کا امتحان لینے پر مقرر ہو گیا۔ اس کا انتقال ۱۵۱۲ء میں بمقام سیول ہوا۔

کولمبس کی طرح اپنے سفر امریکہ کے حالات امیریگو نے بھی لکھے ہیں۔ اور

اتفاق دیکھئے کہ اپنے دوست کولمبس کی طرح امیریگو بھی اپنی تحقیقات کی اہمیت سے واقف نہ تھا۔ یہ حالات کسی طرح جرمنی میں پہنچ گئے۔ ۲۵۔اپریل ۱۵۰۷ء کو کسی جرمن پروفیسر والڈس ملر نے جغرافئے پر ایک کتاب شایع کی جس کے آخر میں ضمیمے کے طور پر امیریگو کے لکھے ہوئے حالات کو بھی لاطینی میں ترجمہ کرکے شامل کردیا۔

سب سے پہلے امریکہ کا نام اسی کتاب میں تجویز کیا گیا تھا۔ زمین کے آباد سطح کے تین حصوں ایشیا یورپ اور افریقہ کا ذکر کرکے والڈس ملر نے چوتھے حصے کے انکشاف کے متعلق لکھا ہے کہ "اب اُن حصوں کی خوب چھان بین کی گئی ہے اور امریکس "ویسپوسی نے ایک اور چوتھا حصہ بھی دریافت کیا ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ اُسے اس کے دریافت کرنے والے کے نام پر جو ایک تیز فہم آدمی ہے۔ صحیح طور پر امیرائک یا امریکا (یعنی سرزمین امیریکس) کہنے سے کون سا امر مانع ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ایشیا اور یورپ دونوں نے اپنے نام عورتوں کے نام پر پائے ہیں"۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ "اگر امریکا کا نام والڈس ملر تجویز نہ کردیتا تو اس کا نام اٹلانٹس ہوتا (کیوں کہ وہ بحر اٹلانٹک میں واقع ہے) یا ہیسپرائیڈز (ایک جہاز راں کا نام) یا سینٹا کروز (یہ بھی ایک جہاز راں ہے) یا نیو انڈیا (کیونکہ کولمبس نے اسے ہندوستان سمجھا تھا) یا شاید کولمبیا (کولمبس کے نام پر)

والڈس ملر نے یہ نام صرف جنوبی امریکہ کا تجویز کیا تھا۔ اور کچھ عرصہ تک اسی کے ساتھ مخصوص رہا۔ مگر بہت جلد دونوں حصے اس نام سے منسوب ہوگئے۔ اور ابھی تک وہی نام چلا جاتا ہے۔ اور امید ہے کہ آئندہ رہے گا۔

(تفہیم الملک اکتوبر ۱۹۰۶ء)

۵۴

ترقی اور راحت کے عجائبات

(الموید سے ترجمہ)

اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے درمیان بحری سفر میں تمام وہ اسباب راحت مہیا ہوتے ہیں۔ جو بری سفر میں مسافر کو حاصل ہونے ممکن ہیں۔ اگر یورپ یا امریکہ کے کسی جہاز میں آپ سوار ہوں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کسی نفیس ہوٹل کیا بلکہ لنڈن اور پیرس میں ہیں ؛

لیکن یہ تمام تکلفات بحر اطلانطک کے جہازات ہی تک محدود ہیں کیوں کہ ان کمپنیوں کو محسوس ہوگیا ہے۔ کہ مسافر اور اکثر اہل ثروت جو صرف کثیر کے کفیل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی اصلاحات کی خواہش رکھتے ہیں۔ انہی اسباب راحت میں سے ایک یہ ہے۔ کہ امریکا جانے والے جہازوں میں وہ تمام چیزیں ملیں گی۔ جو بڑے سے بڑے شہر کے ہوٹلوں میں دست یاب ہوسکتی ہیں۔ اور آپ کو گمان بھی نہ ہوگا۔ کہ آپ آدمیوں سے علیحدہ اور دنیا سے دور ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ بے تار کی خبر رسانی کے ذریعہ سے ہر روز بلکہ ہر گھڑی تازہ تازہ اور ضروری خبریں آپ کو ملتی رہیں گی۔ اور بیچ سمندر میں بیٹھے ہوئے جب چاہیں نیویارک اور لنڈن میں اپنے دوستوں یا کارپردازوں یا شرکا سے نامہ و پیام کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو روزانہ اخبارات بھی پڑھنے کو مل سکتے ہیں جو جہاز ہی پر تیار ہوتے اور وہیں چھپتے ہیں۔ اور ان میں بے تار کی خبر رسانی کے ذریعہ سے خبریں حاصل کرکے درج کی جاتی ہیں۔ گویا آپ پیرس کے ہوٹل بلاش فنڈوم یا مصر کے ازبکیہ میں ہونگے۔ رہنے کا یہ اہتمام ہے۔ کہ سونے کے کمرے علیحدہ ہیں اور بیٹھنے کے جدا۔ حمام الگ بنے ہوئے ہیں۔ آپ کی خواب گاہ میں ڈرائنگ روم میں اور جہاز کے دوسرے ضروری حصوں میں ٹیلیفون لگا ہوگا۔ سونے کے لئے آپ کو تانبے کا اتنا بڑا پلنگ ملے گا۔ جیسا گھروں میں یا ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ بحر اطلانطک کے اکثر جہازوں

سے جڑے ہوئے پلنگوں کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ اگر آپ روپیہ خرچ کر سکتے ہیں
تو آپ کو نہایت آراستہ علیحدہ کمرہ دے دیا جائے گا۔ جو آپ کے سارے متعلقین
کے لئے کافی ہو اور اگر آپ تنہا ہیں۔ تو ایک کمرہ آپ کے لئے رزرو کر دیا جائے گا۔

ان جہازوں میں پہلے کی طرح اب یہ بھی نہیں ہوتا۔ کہ تمام مسافروں
کے لئے کھانے کی میز صرف ایک ہو۔ اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی میزیں الگ
الگ بنا دی گئی ہیں۔ کھانا دن میں ہر وقت مل سکتا ہے۔ مسافر اس کا پابند
بھی نہیں ہے۔ کہ اوقات معینہ ہی پر یا سب کے ساتھ یا ایک ہی قسم کا کھانا
کھائے۔ بلکہ آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں طلب کریں باورچی فوراً وہی حاضر
کرے گا۔ مسافر اوپر نیچے جہاز کے جس حصہ میں چاہے آمد و رفت کر سکتا ہے
اور جہاں بیٹھ کر چاہے چائے قہوہ وغیرہ منگا سکتا ہے۔ جہاز کے ایک حصہ میں
سبزہ اور پھول دار پودے بھی لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ مصنوعی فوّاروں کا
التزام بھی ہوتا ہے۔ یہاں لکھنے پڑھنے کا اعلےٰ قسم کا سامان مہیا رہتا ہے
گرمی کے وقت برقی پنکھے چلتے ہیں۔ تفریح کے کھیلوں اور ریاضت جسمانی کے
لئے کمرے مخصوص ہوتے ہیں۔ ہیمبرگ کی ایک کمپنی نے تو اپنے ایک جہاز پر
ترکی حمام تک کا اہتمام کر رکھا ہے۔ مریضوں کے واسطے شفا خانہ ہے۔ بچہ
والی عورتیں چاہیں تو الگ کمرہ میں رہ سکتی ہیں۔ مصوّروں کے لئے ایک
تاریک کمرہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ پھول فروخت ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کام
زیادہ ہے۔ تو ایک کاتب کے سپرد کر دیجئے۔ اور وہ تھوڑی دیر میں اسٹینوگرافی
کے ذریعہ سے لکھ کر کام آپ کے حوالہ کر دے گا۔

اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں جن سے مسافر آرام پاتے
اور کمپنیوں کے مالک نفع اٹھاتے ہیں۔ انتخاب لاجواب ۲۱ نومبر ۱۹۰۶ء

۵۵

صلیبی لڑائیاں

(مجلۃ المجلات سے ترجمہ)

تعریف صلیبی لڑائیاں وہ لڑائیاں ہیں۔ جو قرون وسطیٰ میں مغرب کے عیسائیوں اور مشرق کے مسلمانوں کے مابین ہوئیں۔ اور جن کا سلسلہ ۱۱ ویں صدی عیسوی سے ۱۳ ویں صدی مذکور تک جاری رہا۔ چونکہ ان لڑائیوں سے مشرق والوں کو دینی اور مغرب والوں کو کثیر التعداد دنیاوی نوائد حاصل ہوئے۔ اس لئے ان کے اسباب ان کے واقعات اور پھر اُن کے نتائج کا بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

اسباب گیارھویں صدی کے آخری حصہ میں سلجوقی ترکوں کی سلطنت نہایت قوی ہو گئی تھی۔ انھوں نے ایشیائے کوچک کو فتح کر لیا تھا۔ اور ان کے قلمرو کا دائرہ بحیرۂ اسود تک وسیع ہو گیا تھا اس لئے قدرتی طور پر اس قوم کی قوت و ترقی قسطنطنیہ کے لئے خطرہ سے خالی نہ تھی۔ اس وقت قسطنطنیہ مشرقی سلطنت یونان کے قبضہ میں تھی۔ پس جب اس نے سلجوقی خطرہ کو محسوس کر کے اپنے پایہ تخت کی حفاظت کے لئے مغرب کے مسیحی ملکوں سے مدد طلب کی۔ مگر چونکہ شاہ یونان اور پوپ نکولس اول میں باہم ناچاقی ہو چکی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ یونان کا کنیسہ روما کے کنیسہ سے الگ ہو گیا تھا اور یہ عیسائی سلطنتیں پوپ کے زیر اثر تھیں) اس واسطے ابتداءً ان مغربی مسیحی ممالک نے سلطنت یونان کے استغاثوں کی جانب کچھ توجہ نہ کی۔ لیکن رفتہ رفتہ سلجوقیوں کے خلاف یونان کی مدد پر آمادہ ہو گئے۔ اسی زمانہ میں بیت المقدس کے عیسائی حجاج کو یہ شوق پیدا ہوا کہ مسلمانوں سے لڑ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کو اپنے قبضہ میں لے آئیں۔ انھی حجاج میں ایک نوجوان سپاہی پیٹر ہرمٹ تھا جس نے رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ اس نے پوپ اربن ثانی سے اجازت حاصل کر کے فرانس میں قبر مسیح کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکال لینے کا غلغلہ شروع کیا

پیٹر کے وعظ سے لاکھوں عیسائیوں کی رگ حمیت جوش میں آئی۔ اور وہ مذہبی جنگ کے لیئے آمادہ ہو گئے۔ جس نے ساری مسیحی دنیا کو متصل دو صدیوں تک ایک غیر معمولی ہیجان میں رکھا اور انسانی خون کے دریا بہا دیئے۔

واقعات | پہلی لڑائی کیلیے عیسائیوں کی جو فوج مرتب ہوئی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ عوام الناس اور فقراء سے مرکب تھا۔ جو ربیع ۱۰۹۶ء میں روانہ ہوا۔ اور جس میں مجاہدین کی تعداد ۶ لاکھ تھی۔ اور تین راہب جن میں ایک پیٹر ہرمٹ بھی تھا۔ ان مجاہدین کے سر پہ تھے۔ لیکن اس فوج کا اکثر حصہ تو راستہ ہی میں ہلاک ہو گیا۔ اور جو بچ کر میدان میں پہونچا۔ انہیں ترکوں نے تہ تیغ کر دیا اس کے بعد دوسرا حصہ جس میں فرانس کے شرفاء و امراء شامل تھے روانہ ہوا اور ربیع ۱۰۹۷ء میں قسطنطنیہ پہونچا اور وہاں پہنچ کر گاڈ فرے کو جو لورین (فرانس) کا ایک رئیس تھا اپنا سردار منتخب کیا اور ایشیا کی طرف بڑھے۔ یہ فوج عزہ (شام) پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اور ۸ مہینے کے محاصرہ کے بعد انطاکیہ کو بھی فتح کر لیا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ لڑائی کی مصیبت کے علاوہ ان کے لشکر میں طاعون نمودار ہو گیا۔ پھر یہ کہ اس ملک کی گرمی وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم لے دے کر ۱۴ جولائی ۱۰۹۹ء کو انہوں نے بیت المقدس فتح ہی کر لیا۔ اور اسے ملک مفتوحہ کا صدر مقام قرار دیا۔ اور گاڈ فرے کو "شاہ اورشلیم" کا لقب دے کر بادشاہ بنایا۔ لیکن گاڈ فرے نے اسے پسند نہ کیا۔ اور ملک کو اس زمانہ کے یورپین دستور کے مطابق اشراف فاتحین میں تقسیم کر دیا۔ مگر فتح بیت المقدس سے ایک سال کے اندر جب گاڈ فرے مر گیا۔ تو ان کی جمعیت پراگندہ اور قوت ضعیف ہو گئی۔ ۱۱۴۴ء میں ترک پھرے اور سارا ملک مفتوحہ واپس لے لیا۔

دوسری لڑائی | کے لئے عیسائیوں کو برنارڈ نامی ایک راہب نے پھر ابھارا اس مرتبہ فرانس اور جرمنی سے جو فوجیں آئیں۔ ان کی کمان خود وہاں کے بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی۔ شاہ جرمنی کونراڈ ثالث شاہ فرانس لوئس سابع سے پیشتر میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ اور لڑائی شروع کر دی تھی۔ لیکن اسے کوہ [illegible] کی گھاٹی میں ہزیمت فاش اٹھانی پڑی۔ اور بقیۃ السیف کو لے کر

بھاگ کھڑا ہوا۔

اب شاہ فرانس کا حال سنئے ابتداء میں تو اس نے سمندر کے کنارہ کا راستہ اختیار کیا۔ مگر پھر اس سے تنگ آکر مع امرائے فرانس جہاز پر سوار ہوگیا۔ اور فلسطین کی راہ لی رولس نے ارض مقدس پہنچ کر دمشق کے محاصرہ کا ارادہ کیا لیکن ترکوں کے مقابلہ میں پس پا ہو کر ۱۱۴۹ء میں فرانس کو واپس چلا گیا۔ اس کے بعد ارض مقدس کی سلطنت سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس سے مغرب کے عیسائیوں کی آتش حسد اور بھی تیز ہوگئی اور انہوں نے تیسری جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس لڑائی میں فرانس کے تین ہزار مجاہدین مسلمان بھی ہو گئے تھے۔

تیسری صلیبی لڑائی | کے ہیرو باربروس اول شاہ جرمنی فلپ آگسٹس ثانی اور شاہ فرانس اور رچرڈ شیر دل شاہ انگلستان تھے۔ جرمنی کی فوج پہلے پہنچ گئی تھی اور ایک معرکہ میں سلطان صلاح الدین کو اس نے شکست بھی دی لیکن آخر جرمن مجاہدین کا نظام پراگندہ ہوگیا۔ اور فلسطین ان میں سے معدودے چند پہونچے۔ اس کے بعد فلپ آگسٹس اور رچرڈ آئے۔ مگر ان دونوں میں بنی نہیں فلپ تو ۱۱۹۱ء میں فرانس کو لوٹ گیا۔ مگر شیر دل صلاح الدین کے مقابلہ کے لئے اڑا رہا۔ بلکہ یافا۔ رملہ اور عسقلان پر قابض ہوگیا۔ اس کے بعد صلح بھی ہوگئی۔ مگر بیت المقدس پر سلطان ہی کا تسلط رہا۔

چوتھی لڑائی | کا بانی فولک نامی ایک راہب تھا۔ اس مرتبہ فوج شمالی فرانس کے شرفا سے بوڈوان کونٹ ڈی فلانڈر کی سرداری میں مرتب کی گئی اور سفر بحری اختیار کیا گیا۔ اسی زمانہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ کے خلاف وہاں سخت شورش بھی ہوئی تھی۔ اس نے ان مجاہدین سے مدد چاہی۔ یہ لوگ قسطنطنیہ گئے اور شہنشاہ کے بیٹے قیس ثانی کو تخت نشین کر دیا۔ لیکن جب قیس نے تاج اپنے سر سے اتار دیا تو مجاہدین نے شہر پر خود قبضہ کر لیا۔ اور کونٹ ڈی فلانڈر کو شہنشاہ بنا کر اور یونان کی سلطنت کو تقسیم کر کے اس زمانہ کے فرانسیسی دستور کے مطابق امرا کو مختلف حصوں پر مسلط کر دیا۔ اس طرح تیسری صلیبی جمعیت نے فلسطین کی حالت میں

کوئی تغیر پیدا نہیں کیا۔ عیسائیوں کا اب بھی یہ عقیدہ ہے۔ کہ ان لڑائیوں میں مسیحی مجاہدین کو فتح حاصل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ نہایت بداخلاقی پر اتر آئے تھے۔ اور اُن سے ایسے افعال قبیحہ سرزد ہوتے تھے کہ دین عیسوی نے بھی انہیں جایز نہیں رکھا ۔

پانچویں لڑائی | میں مسیحی فوج کا سردار شان ڈی برائن بجائے فلسطین کی طرف آنے کے مصر پر چڑھ گیا۔ اور شہر دمیاط پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنی فوج کو لئے ہوئے اندرون حصہ ملک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مگر نیل نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور وہ مسلمانوں سے معاہدہ اور دمیاط کو خالی کر کے فرانس کو لوٹ گیا ۔

چھٹی لڑائی | فریڈرک ثانی شہنشاہ جرمنی کی نگرانی میں ہوئی۔ لیکن وہ بجائے لڑنے کے مسلمانوں سے معاہدہ کر کے فلسطین کو خالی کر گیا ۔

ساتویں لڑائی | کے لئے لوئس شاہ فرانس کھڑا ہوا۔ اور دمیاط پر حملہ کر دیا۔ مگر وہاں ہزیمت اٹھا کر صلح کے بعد فلسطین آگیا۔ اور یہاں تین سال تک پڑا رہا ۔

آٹھویں جنگ | اس لڑائی کا بانی بھی لوئس ہی تھا۔ اس دفعہ اس نے تونس پر حملہ کیا۔ مگر اس کے لشکر میں طاعون پھیل گیا۔ اور وہ مع کثیر التعداد فوج کے ۱۲۷۰ء میں وہیں مر گیا ۔

نتیجہ | ان لڑائیوں کا رنگ تمام دوران میں مذہبی رہا۔ لیکن اس حیثیت سے عیسائیوں کو کچھ فائدہ نہیں پہونچا۔ کیونکہ ارض مقدس کی سلطنت چند روز عیسائیوں کے قبضہ میں رہ کر پھر مسلمانوں کی تحت میں آگئی۔ اور اب تک چلی جاتی ہے۔ البتہ ان سے جو مادی نتائج پیدا ہوئے وہ قابل ذکر ہیں۔ مشرق اور مغرب میں تجارتی تعلقات پیدا ہونے کا سبب یہی لڑائیاں ہوئیں۔ مغربی قوموں نے مشرقیوں سے حریر اور کتان کی صنعت سیکھی اور ان کے علاوہ دیگر مصنوعات کی تعلیم حاصل کی۔ اور آلو بخارے تُوت اور نیشکر وغیرہ کا بیج اپنے ملکوں میں لے گئے۔ انھی لڑائیوں کی وجہ سے مذ...ب میں امرا کا اثر کم ہو کر مساوات کا راستہ کھل گیا۔ اور مختلف عیسائی قوموں کے مابین ...ابط استحاد قوی ہو گیا۔ ادھر سلجوقی ترکوں کی قوت میں ضعف آگیا جسکا قدرتی اثر یہ ہوا کہ قسطنطنیہ کی فتح میں دو صدیوں کی دیر ہو گئی ۔ (انتخاب لاجواب ۲۸ - نومبر ۱۹۰۶ء)

مریخ کے باشندے

مشہور عالمان سائنس کا خیال

اجرام فلکیہ میں سے جس جرم کا مطالعہ انسان نے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ مریخ ہے۔ علمائے ہیئت جدیدہ نے اس سیارہ سے اپنی دل چسپی کا ثبوت یہاں تک دیا ہے۔ کہ اس کا جغرافیہ بھی بڑی صحت کے ساتھ بنا ڈالا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری دنیا اور مریخ کے مابین بہت سی مابہ التشابہ چیزیں ہیں۔ زمین کی طرح مریخ میں بھی بّر اعظم ہیں۔ سمندر ہیں جزیرے اور جزیرہ نماہیں۔ خلیجیں اور جھیلیں ہیں۔ وہاں بادل بھی آتے ہیں مینہ بھی برستا ہے۔ برف بھی پڑتی ہے۔ ربیع وخریف اور رات دن کا تواتر بھی جاری ہے۔ البتہ وہاں کے سال اور دن ہمارے سالوں اور دنوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ یعنی مریخ کا سال ۶۸۷ دن ۲۴ گھنٹے ۳۷ منٹ اور ۲۳ سکنڈ کا ہوتا ہے۔ وہاں کی آب وہوا اور موسمی حالت بھی اس قابل ہے۔ کہ انسان حیوانات اور نباتات کا نمو ہو سکے۔ اس لئے قدرتی طور پر مریخ کے متعلق ہم ساکنان ارض کو جس جانب سب سے زیادہ توجہ ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے باشندے ہیں ؀

اس امر پر تو تمام سائنس دانوں کا اتفاق ہے۔ کہ مریخ پر ایسے لوگ آباد ہیں۔ جن کی جسمانی ساخت اور طریق ماندوبود ان کے سیارہ کی خاص خصوصیات کے لئے بالکل موزوں ہے۔ لیکن اس امر پر وہ کوئی رائے قایم نہیں کر سکے۔ کہ بلحاظ مریخ کی خصوصیتوں کے ان لوگوں کی شکل کیسی ہوگی؟

مشہور ہیئت دان کامیل فلیمیرین مرّیخ کا مطالعہ خاص غور کے ساتھ تقریباً ۴۰ سال گزشتہ سے کرتا رہا ہے۔ اس کا خیال ہے۔ کہ یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ چوں کہ زمین کے باشندوں کو ایک خاص قسم کی آب وہوا گرمی سردی اور ایسے پانی کی ضرورت ہے۔ جس میں دو حصے ہائڈروجن اور ایک حصہ

آکسیجن ہو۔ جو اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے لازمی ہے۔ اس لئے مریخ کے باشندوں کو بھی ان چیزوں کی حاجت ہو گی ۔

پروفیسر مذکور کی رائے میں مریخ کے باشندے ہم سے بہت آگے ہیں۔ چونکہ مریخ کی عمر زمین سے کئی لاکھ سال زیادہ ہے۔ اس لئے اس کے باشندے بھی بہ نسبت ہمارے یقیناً زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور علم طبیعات خصوصاً فلکیات میں وہ ہم سے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں گویا ہمارا علم ہیئت محض عالم طفولیت میں ہے۔ وہ ہمارے سیارہ سے اس سے زیادہ واقف ہیں جتنا ہم ان کے سیارہ کی نسبت جانتے ہیں ۔

چوں کہ ان کے سال ہمارے سالوں سے دو چند ہوتے ہیں۔ اور ان کے موسمی حالات بھی بہت زیادہ خوش آیند ہیں۔ اس لئے انہیں اور بھی کئی قسم کے فوائد حاصل ہیں۔ ان کے جسم زیادہ ہلکے ہیں۔ اور وزنی چیزوں کو زیادہ سرعت کے ساتھ پھینک سکتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ مریخ کی کشش ثقل زمین کی بہ نسبت صرف ایک ثلث ہے۔ حالانکہ سیارہ کا جرم زمین سے بہت چھوٹا اور ہلکا ہے ۔

اس بنا پر پروفیسر فلیمیرین، سر رابرٹ بال، سر ولیم رامسے۔ سر پرسیول لوویل اور بہت سے دوسرے ممتاز علمائے ہیئت کو یقین کامل ہے کہ مریخ کے باشندے دیو قد ہوتے ہیں ۔

کشش ثقل کی مثال یوں سمجھ لیجئے۔ کہ اگر مریخ کا باشندہ جس کا قد معمولی انسان سے تگنا ہو زمین پر آ جائے۔ تو اس کا وزن اپنے اصلی وزن سے ۲۷ گنا بڑھ جائے گا لیکن چونکہ اس کے اعصاب انسان کے اعصاب سے آٹھ گنے سے کچھ زیادہ ہیں۔ اس لئے مریخ کا باشندہ اپنے جسم کے بوجھ کو سنبھال نہیں سکے گا۔ اور زمین پر پڑا رہے گا۔ گر اپنے کرہ پر وہ انہیں آٹھ گنے اعصاب کو لے کر ایسی ہی تیزی سے دوڑ سکے گا۔ جیسے ایک انسان اس زمین پر ۔

کام کے لحاظ سے "مریخیا" ۹ آدمیوں کی برابر کام کرسکتا ہے کیونکہ

مریخ کی ہوا کا ہلکا پن مریخیوں کی محنت بھی
کم کر دیتا ہے۔ اس لئے تخمیناً مریخیئے کے
ایک ہفتہ کا کام آدمی کے تقریباً ۵۰ دن
کے کام کے برابر ہے ؎
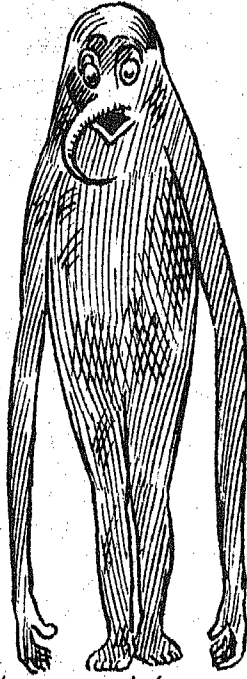
سر رابرٹ بال کے نزدیک مریخیوں
کی ناکیں بہت لمبی اور ہاتھ نہایت دراز
اور پتلے ہوتے ہیں۔ ان ہاتھوں سے وہ
بغیر جھکے، اپنے پاؤں کی انگلیاں چھو سکتے
ہیں۔ اور باوجود پتلے ہونے کے اس قدر
مضبوط ہوتے ہیں۔ کہ دیوار کی منڈیر یا
درخت کی چوٹی ہاتھ سے پکڑ کر اچک کر
اس پر چڑھ سکتے ہیں ؎

باشندگان مریخ کی شکل بقول سر رابرٹ بال

مریخ کی ہلکی ہوا پر قیاس کر کے
پروفیسر گریگری کہتا ہے۔ کہ مریخیوں کے پھیپھڑے اور سینے بہت بڑے
ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے سے آلات تنفس ان کے لئے محض بے کار ہیں گریگری
کی رائے کے مطابق مچھلی کی طرح ان
کے متعدد گلپھڑے بھی ہونے چاہئیں۔
تاکہ ہوا کافی مقدار میں بلا دقت اندر
داخل ہو سکے ؎

عمانویل سویڈنبورک اس نتیجہ پر
پہنچا ہے۔ کہ مریخ کے باشندے بالکل آدمی
کی شکل ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے۔ کہ ان
کی ٹھوڑیاں نہیں ہیں۔ بجائے پنجوں
کے کھر ہیں۔ اور بندروں کی سی ایک
دم بھی لگی ہوئی ہے ؎

باشندگان مریخ کی شکل بقول پروفیسر گریگری

باشندگان مریخ کی شکل بقول ماہرین فلکیات انگریز

جینیوا یونیورسٹی کے پروفیسر فلورنوائی کا خیال مریخیوں کی نسبت یہ ہے۔ کہ وہ صورت شکل میں آدمی کی طرح ہیں البتہ قد و قامت میں بہت بڑے ہیں۔ لیکن یہ خیال درحقیقت ایک لیڈی کے بیان سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس پر ہپناٹزم کا عمل کرکے باشندگان مریخ کے متعلق دریافت کیا گیا تھا۔ جو کچھ اس لیڈی نے بیان کیا ہے۔ وہی پروفیسر فلورنوائے نے سائنٹفک قالب میں ڈھال دیا ہے ‪:‬

ایک عالم اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ مریخ والوں کا جسم چوپایوں سے ملتا جلتا ہے۔ سر پر دو سینگ بھی ہیں۔ تھوتھنی سور کی سی ہے ہاتھ آدمی کے سے۔ اور پاؤں بندر کے سے ہیں۔ چلتے بھی چاروں ہاتھ پاؤں سے ہیں ‪:‬

باشندگان مریخ کی شکل بقول پروفیسر فلورنوائے
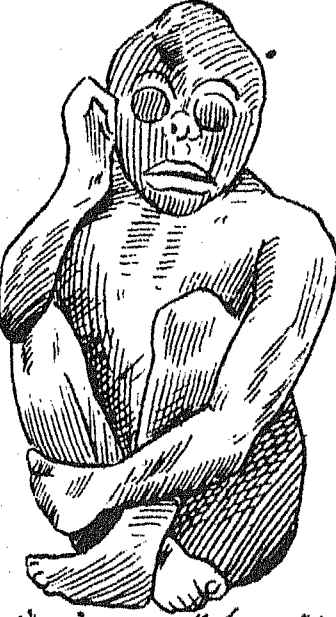
اس وقت جب کہ علماء کو اس امر کا یقین ہو گیا ہے۔ کہ مریخ پر آبادی ہے۔ تو دوسرا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ان لوگوں سے گفتگو کیسے کی جائے۔ ولیم مارکونی اور نکولا ٹسلا دونوں ماہران برق کو پختہ امید ہے۔ کہ زیادہ مدت گزرنے سے قبل ہم اس حیرت انگیز مگر عظیم الشان کام کو انجام دے لیں گے۔ مارکونی تو یہاں تک اطمینان دلاتا ہے۔ کہ دس سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء تک میں اپنی بے تار کی خبر رسانی کے آلات کے ذریعہ سے مریخ پر پیغام پہنچا سکوں گا جسے

مریخ والے اپنی اعلیٰ ذہانت و طباعی کے
زور سے بلا شبہ سمجھ لیں گے۔ چونکہ مریخ اور
زمین کے مابین خلائی بعید کا سلسلہ ایک
ہے۔ اس لئے مارکونی کی رائے میں جس
وقت کوئی ایسی قوت حاصل ہو گئی۔ کہ
اس کے ذریعہ سے برقی رَو مریخ تک پہنچ
سکے۔ اسی وقت نامہ و پیام کا آغاز ہو جائیگا

باشندگان مریخ کی شکل ایک عالم کی رائے کے مطابق

نکولا ٹسلا کی تجویز ہے کہ بمقام وارڈن کلف
(واقع جزیرہ لانگ) ایک بہت بڑا مینار بنایا جائے۔ اور وہاں آلات برق لگا کر آبشار نیاگرا
کے ذریعہ ایک ارب گھوڑوں کی طاقت بہم پہونچائی جائے۔ اگرچہ برقی رَو مریخ تک پہونچانے
کے لئے صرف ایک کروڑ گھوڑوں کی طاقت کافی ہے لیکن۔ ایک ارب کا اندازہ احتیاطاً کیا گیا ہے
بعض ہیئت دانوں نے مریخ کو رصد کرتے وقت معلوم کیا ہے۔ کہ جب وہ
زمین کے قریب آتا ہے۔ تو اس کے کرۂ ہوا میں ایک غیر معمولی تلاطم پایا جاتا ہے
اور اس تموج کے فوٹو لئے گئے ہیں۔ تو معلوم ہوا ہے۔ کہ بعض شکلیں کئی کئی بار
آتی ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ یہ کوئی تحریر ہے۔ جسے مریخ کے باشندے
بہت بڑی قوت کے ذریعہ سے زمین تک پہنچاتے ہیں۔ تاکہ زمین والے اُسے
سمجھیں اور اس کا جواب دیں۔ اور اس طرح دونوں سیاروں کے درمیان
گفتگو کا سلسلہ قایم ہو جائے۔ بعض رصد گاہوں کو مریخ کی جانب سے علی الدوام
کچھ اشارے ملتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں سے قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ
مریخ کے باشندوں کے پاس کوئی ایسی قوت موجود ہے جس کی وساطت سے
وہ برقی رَو ہم تک پہنچا سکتے ہیں۔ حالانکہ ہم ابھی اس کی تلاش ہی میں ہیں۔
کوئی شک نہیں کہ وہ وقت دنیا کے علوم کی تاریخ میں بے نظیر ہوگا
جب کہ مریخ اور زمین کے مابین بات چیت ہونے لگے گی۔ اور اس کے بعد پھر
آمد و رفت کی تدابیر ایک دوسرے کے مشورہ سے سوچی جائیں گی۔

(انتخاب لاجواب ۱۶ جنوری ۱۹۰۶ء)

۵۷
صحرائے اعظم میں بادسموم اور گرد کے طوفان

دنیا کا سب سے بڑا ریگستان صحرائے اعظم افریقہ کے شمال میں ہزاروں میل مربع رقبہ پر واقع ہے۔ افریقہ میں لیبیا اور نوبیہ کے ریگستان اسی کا حصہ ہیں۔ پھر سمندر کو عبور کر کے اس کا سلسلہ عرب۔ ایران۔ ترکستان۔ سندھ۔ پنجاب راجپوتانہ اور گوبی تک پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی ایک شاخ مغربی نصف کرہ یعنی امریکہ میں بھی پہنچ گئی ہے اور اس طرح گویا اس نے کرۂ ارض کو بالکل گھیر لیا ہے ؛

علمائے طبقات الارض کا خیال ہے کہ ایک زمانہ میں جب کہ خشکی اور تری کی تقسیم موجودہ صورت پر نہ تھی۔ ان ریگستانی مقامات پر سمندر موجیں مارتا رہا۔ یہاں تک کہ قرن پر قرن گزرنے کے بعد پانی کی جگہ خشکی نے لی اور جہاں پہلے خشکی تھی۔ وہاں پانی چلا گیا۔ اور اپنی جولان گاہ پر ایسے نشانات چھوڑ گیا۔ جن سے ہم کسی زمانہ میں اس کے وہاں موجود ہونے کے دعوے کی تصدیق کر سکیں ؛

صحرائے اعظم میں دوسرے ریگستانوں کی طرح جا بجا نخلستان بھی ہیں جہاں میٹھا پانی ملتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور کھجوروں کے جھنڈ سایہ کرتے ہیں اور اگر کوئی تھکا ماندہ مسافر دوپہر کے وقت کسی ایسے مقام پر پہنچ جائے تو گویا دوبارہ زندگی پاتا ہے ؛

یہاں گرمی دن میں (۱۵۰) درجہ تک کی پڑتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہانڈی میں گوشت ڈال کر اسے ریت پر رکھ دیا جائے۔ تو بے تکلف پک جاتا ہے لیکن رات کو آلہ مقیاس الحرارت (پارہ) صفر سے بھی نیچے جا گرتا ہے وجہ یہ ہے۔ کہ چونکہ یہاں کی ہوا میں اجزاء مائیہ بہت کم ہوتے ہیں اس لئے غروب آفتاب کے بعد وہ زمین کی گرمی ذرا بھی قائم نہیں رکھ سکتی ؛

صحرا کا ایک اور قدرتی کرشمہ سراب ہے۔ ایک راہ رو دریا بالکل ممکن

ہے کہ ایک قافلہ مارے گرمی اور دھوپ کے رَبَّنَا آتِنَا عَذَابَ النَّارِ یا پیاس کے سبب سے العطش العطش پکار رہا ہے۔ سامنے افق پر یکایک کوئی جھیل یا چشمہ یا نخلستان نظر آتا ہے۔ پیاسے انسان اور حیوان پانی یا سایہ کی امید میں اس طرف دوڑتے ہیں لیکن افسوس موقع پر پہنچ کر نہ پیاس بجھانے کی کوئی چیز ہوتی ہے نہ سایہ میں بیٹھنے کا سامان۔ بلکہ وہی جلتا ہوا ریت اور وہی شعلہ فگن آسمان۔ پھر امید کے اتنی دور جانا اور مایوس آنا سخت آفت جان و بلائے بے درمان ہوتا ہے قرآن شریف میں منکرین کی نسبت آیا ہے کہ "ان کے اعمال ہموار زمین پر سراب کی طرح ہیں۔ جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے اور جب اس کے نزدیک پہنچتا ہے تو سوائے خدا کے (نام کے) وہاں کچھ نہیں پاتا"

اس کے بعد باد سموم کی کیفیت سنئے۔ ایک یورپین سیاح ڈبلیو۔جی پال گریو (۱۸۲۶ تا ۱۸۸۸ء) نے عرب کے ریگستان میں باد سموم کی آمد کا حال اس طرح لکھا ہے: "دوپہر کا وقت تھا کہ یکایک جنوب سے ٹھیر ٹھیر کر لو کے جھونکے آنے لگے۔ ہوا کی تندی بڑھتی گئی۔ میں نے اور میرے ساتھی نے ایک دوسرے پر تعجب نگاہ ڈالی۔ کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اور اس کا حشر کیا ہوگا؟ ہم نے اپنے عرب ساتھی سلیم اور دو صحرائی بدوؤں کو دیکھا کہ انھوں نے اپنے چہرے کپڑوں میں لپیٹ رکھے ہیں۔ اور اونٹوں کو مار مار کر آگے بڑھا رہے ہیں۔ اور اونٹ ہیں کہ بیٹھے ہی جاتے ہیں۔ ہم نے سلیم سے اس کا سبب پوچھا۔ تو اس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ آخر بار بار پوچھنے کے بعد اس نے کہا کہ "جس طرح ہو سکے اس سامنے والے خیمہ میں پہنچو۔ اگر وہاں پہنچ جاؤ گے تو جان بچ جائے گی۔ دیکھو تمہارے اونٹ بیٹھ نہ جائیں"۔ خوش قسمتی سے خیمہ سو گز کے ہی فاصلہ پر تھا

اس عرصہ میں ہوا کی تیزی اور بھی بڑھ گئی۔ اور تپش کا تو یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دوزخ اتر آیا ہے۔ یا زمین ہی پر کوئی نیا دوزخ پیدا ہو گیا ہے ہمارے اونٹ بیٹھنے کے لئے برابر پاؤں توڑنے کی کوشش کر رہے تھے آخر دے کے خیمہ میں پہنچے۔ جہاں ایک عورت منہ لپیٹے اوندھی پڑی ہوئی تھی ہم پانچ آدمیوں کو وہ خیمے میں داخل ہوتے دیکھ کر گھبرا گئی مگر سلیم نے "ابا ابا"

پھر اس کا اطمینان کر دیا۔ عورت نے اپنے اور ہمارے بیچ میں ایک پردہ حائل کر دیا۔ ہمارے اُترتے ہی اونٹ ہوا کی طرف سے پیٹھ پھیر کر اور ناکیں ریت میں گاڑ کر مردے کی طرح پڑ رہے ادھر خیمہ میں ہم سب منہ لپیٹے پڑے ہوئے تھے اندھیرا اتنا تھا کہ بالکل رات ہو گئی تھی ہم اس حالت میں تقریباً
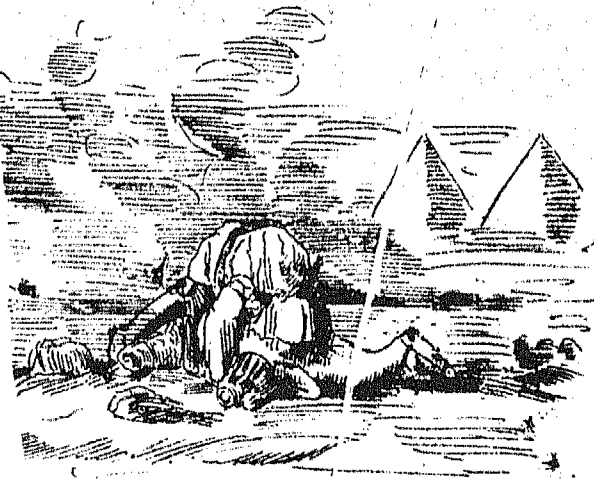
صحرائے عرب میں بادسموم کا طوفان

دس منٹ رہے ہوں گے۔ کہ اندھیرا گھٹا۔ اور ہوا کی گرمی اور تیزی کم ہوئی۔ جب ہم اُٹھے ہیں۔ تو ہماری شکلیں مردوں کی سی تھیں۔ سموم کے دوران میں ہوا گرد و غبار سے بالکل پاک رہی پھر نہیں معلوم اس تاریکی کا کیا سبب تھا؟ یہ حالت تو ریگستان عرب کی سموم کی ہے۔ اب صحرائے اعظم جو اس سے کہیں بڑا اور طوفان خیز تر ہے۔ اس کی سموم کا اندازہ ناظرین خود آسانی سے کر سکتے ہیں۔

لیکن صحرائے افریقہ کی سب سے بڑی مصیبت خاک کے طوفان ہیں۔ یکایک ہوا چکر کھانے لگتی ہے۔ اور جیسا کہ آپ اگلی تصویر میں دیکھتے ہیں خاک کے ستون بلند ہوتے ہیں۔ ہوا کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے۔ کہ بدنصیب رہ نوردوں کا بھاگ کر نکل جانا بھی سخت دشوار ہوتا ہے۔ جو اہل رسیدہ بھاگ کر اپنی جان نہیں بچا سکتا۔ اس کی وہیں قبر بن جاتی ہے۔ اور وہ سچ مچ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ۵۲۳ ق م مصر کے بادشاہ کیمبیس کی فوج پیٹرالین کے

صحرائے اعظم کا طوفان

منڈکو جو صحرائے افریقہ کے ایک نخلستان میں واقع تھا غارت کرنے کے ارادہ سے اس ریگستان میں پہنچی ہے تو ۵۰ ہزار سپاہی اسی طوفان کی خاک سے غارت ہو گئے۔

ایک فرانسیسی انجینیر نے چند سال ہوئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ صحرا پر سمندر بہا دیا جائے لیکن اس اسکیم پر اتنی لاگت کا تخمینہ تھا کہ دنیا کی چند سلطنتیں بھی مل کر اُسے پورا نہیں کر سکتی تھیں قطع نظر خرچ کے اس میں شک نہیں کہ اگر یہ تجویز عملی صورت اختیار کر لے اور صحرائے افریقہ پر سمندر آ جائے تو امن اعظم اور شاید پڑوس کے ملکوں کی آب و ہوا بالکل بدل جائیگی مگر اسکے ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہے کہ یہاں سمندر آ گیا تو کہیں اور اتنے ہی رقبہ پر خشکی نکل آئیگی جو بالکل ممکن ہے کہ ریگستان ہی ہو۔

(انتخاب لاجواب ۲۰ فروری ۱۹۰۷ء)

۵۸ امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کی نصیحتیں اپنے جانشینوں کو

سنہ ۱۸۸۰ء میں جب امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کابل کے تخت پر بیٹھے ہیں تو خزانہ خالی تھا۔ ملک بدامنی اور خانہ جنگیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ ہمسایہ سلطنتیں اس کے حصے بخرے کرنے کے لئے دندان آز تیز کئے ہوئے بیٹھی تھیں۔ اور اگر موازنہ طاقت مانع نہ ہوتا۔ تو اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتیں ؛

تعلیم کی یہ حالت تھی کہ تخت پر جلوس کرنے کے بعد امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کو تیس ایسے منشیوں کی ضرورت پیش آئی۔ جو اپنی ملکی زبان میں محض لکھ پڑھ سکتے ہوں۔ مگر ملک بھر میں اشتہار دینے سے بمشکل اجمعین تین شخص دستیاب ہوئے۔ غرض کسی قوم یا ملک کے جلد فنا ہو جانے کے جو اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب موجود تھے۔ اور افغانوں میں سوائے فطری جوہر شجاعت کے کوئی انسانی وصف موجود نہ تھا۔ میں اُن ترقیوں کو جو امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم کے عہد میمنت مہد میں ظہور پذیر ہوئیں۔ گنا کر اپنے مضمون کو طول دینا نہیں چاہتا صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ کہ امیر عبدالرحمٰن خاں نے اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے نہ صرف ترقی کی شاہ راہ تیار کر دی۔ بلکہ افغانوں کو منزل مقصود کا آدھے سے زیادہ راستہ بھی طے کرا دیا۔ جس کے لئے وہ آئندہ نسلوں سے "امیر اعظم" کا خطاب پانے کے ضرور مستحق ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کی نسبت علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد خلافت میں دانش مندی کا سب سے بڑا اور آخری جو کام کیا وہ یہ تھا۔ کہ حضرت عمرؓ کے خلیفہ ہونے کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اسی طرح میری رائے میں امیر عبدالرحمٰن خاں کا جانشینی کے مسئلہ کو اس آسانی سے حل کرنا اور امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے اپنے فرزند اکبر اعلیٰ حضرت امیر حال کی تربیت کرنا مرحوم کے عہد کا نہایت شاندار اور تابناک واقعہ ہے۔ دیگر اولو العزم سلاطین کی طرح امیر عبدالرحمٰن خاں نے ایک تزک بھی

لکھی ہے۔ اور اُس میں جا بجا اپنے جانشینوں کو نہایت مفید اور بیش قیمت نصیحتیں کی ہیں۔ جن میں سے چند کو میں ایک جگہ جمع کر کے لکھتا ہوں۔ اس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ شخص جس کے لئے میں نے "امیر اعظم" کے خطاب کی سفارش کی ہے۔ کس پایہ کا تھا۔

(۱) بلا رو رعایت اُن لوگوں کو۔ جو ملازمت اختیار کریں۔ یا ملک میں آکر سکونت پذیر ہوں۔ مساوی حقوق عطا کرے۔ اور اُن کو بلا امتیاز قوم و ملت اپنی رعایا کی مانند سمجھے؛

(۲) اپنے خاص لوگوں اور عزیزوں کو الاؤنس وغیرہ سے مدد دے کر کام کی طرف راغب کریں۔ مگر جو کچھ اُنہیں دیا جائے اس کے مطابق کام بھی اُن سے اُتنا ہی لیا جائے؛

(۳) کبھی غافل نہ ہوں اور برطانیہ عظمےٰ کی مدد پر بھروسا نہ کریں۔ ممکن ہے کہ وہ سلطنت اُن روابط کو۔ جو اس وقت افغانستان کے ساتھ ہیں۔ بدل دے یا کسی وقت افغانستان کو مدد دینا اپنی مصلحت کے خلاف سمجھے؛

(۴) ہمیشہ اُس سچی حکمت عملی کی پیروی کریں۔ جو ہمارے مذہب نے ہم کو سکھائی ہے یعنی "ہر دشواری کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہو۔ اور خدا پر بھروسا کرو"؛

(۵) کوئی یورپین ملک میں بسنے نہ پائے۔ جس وقت کوئی یورپین ملازم یا کاریگر یا معلم اپنا کام ختم کر چکے۔ اور دیسی لوگوں کو کام بخوبی آجائے۔ اور وہ اس کی تعلیم کے محتاج نہ رہیں۔ تب اس کو ہدایت ہو کہ پھر اپنے ملک کو واپس جائے؛

(۶) اگر افغانستان کو ایک عظیم الشان سلطنت بنانا چاہتے ہیں۔ تو اتفاق کی قدر کریں۔ کل شاہی خاندان۔ امراء اور رعایا سب یک دل۔ یک رائے اور ہم غرض ہو کر اپنے گھر کی حفاظت کریں؛

(۷) اگر باوجود عہد ناموں کے انگریز میرے خاندان کے دشمنوں کو مدد دیں تو اس حالت میں مَیں اپنے بیٹوں اور جانشینوں کو یہی صلاح دوں گا کہ وہ

طریقہ اختیار کریں۔ جو میں نے اختیار کیا تھا جب گورنمنٹ نے میرے خلاف امیر شیر علی خاں کو مدد دی تھی۔ یعنی ان سے بہادروں کی طرح لڑ کر فیصلہ کر لیں۔ اور اپنے ملک سے نکال دیں۔ اگر خود شکست کھائیں۔ تو انگریزوں کے خلاف کسی دوسری سلطنت کی حمایت میں جا رہیں۔

(۸) بمقابلہ متوسلین برطانیہ روس کے متوسلین سے زیادہ ہوشیار رہیں

(۹) میرے بیٹے کو چاہیئے کہ قوم پر ثابت کر دے۔ کہ وہ ایک مستقل مزاج صاحب رائے۔ جفاکش اور محب وطن بادشاہ ہے۔

(۱۰) اس درجہ خود رائے نہ ہو کہ کبھی اپنے مشیروں سے مشورہ نہ لے۔ نہ کوئی مشیر اس کے مزاج میں اتنا دخیل ہو۔ کہ اسے موم کی ناک بنا لے۔

(۱۱) ملک میں ہر شخص امیر سے لے کر فقیر تک اس بات کا مجاز ہو۔ کہ کسی معاملہ میں اگر وہ بادشاہ کو اطلاع دینا چاہے۔ تو براہ راست خط و کتابت کر سکے۔

(۱۲) علاوہ روزانہ فرائض کے اپنا علم اور معلومات بڑھانے کے لئے کوئی وقت مقرر کریں۔

(۱۳) سلطنت کے استحکام کے لئے فوج کی جانب توجہ اور اس کا نو ایجاد اسلحہ سے مسلح ہونا اور جدید فنون جنگ کی کتابیں پڑھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱۴) غلہ کے انبار خانے اور سلح خانے ہمیشہ بھرے رکھیں۔

(۱۵) محکموں، نئے قوانین اور ملکی عدالتوں کی توسیع کریں اور ملک کی ترقی و تہذیب کے لحاظ سے قانون میں اصلاح کرتے جائیں۔

(۱۶) کتاب انوار سہیلی بہت اچھی طرح پڑھیں۔

(۱۷) نئی سڑکیں بنوائیں۔ مگر ریل اور تار کا بنوانا اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک ہمارے پاس ملک کی حفاظت کے لئے کافی فوج جمع نہ ہو جائے۔

(۱۸) محکمہ مخبری و خفیہ پولیس کو ہمیشہ اچھی حالت میں رکھیں۔

(۱۹) معدنیات اور دوسرے ذرایع دولت سے فائدہ اٹھائیں۔

(۲۰) کبھی کسی غیر ملک والے کو ریل یا معدنیات کا اجارہ نہ دیں۔ بلکہ خود ریل بنائیں اور کانیں کھدوائیں۔ اگر غیر ملکیوں کو اجارہ دینے کی ضرورت اور مصلحت ہو

تو کم کم ا جائے دئے جائیں۔ اور اُن اقوام کو دئے جائیں جن کے ملک ہمارے ملک سے متصل نہ ہوں۔ مثلاً اطالی۔ امریکن۔ اور جرمن۔ بلکہ اگر یورپین ملازموں کی ضرورت ہو تو بھی انہی لوگوں کو ترجیح دیں ۞

(۲۱) اپنے قول اور وعدہ پہ ثابت قدم رہیں اور ہمیشہ جھوٹ اور عہد شکنی سے احتراز کریں ۞

(۲۲) جب ریل اور تار نکالنے کا وقت آئے۔ تو پہلے ملک کے اندرونی حصے میں سرحدوں سے دور بنائیں ۞

(۲۳) جب افغانستان کو سمندر تک رسائی ہو گئی۔ تو ملک بہت جلد دولتمند اور آسودہ حال ہو جائے گا۔ افغانستان کا جنوبی اور مغربی کونہ خلیج فارس اور بحر ہند سے ملا ہوا ہے۔ اور اسی کے قریب ایک چھوٹا سا بلند میدان قندھار۔ بلوچستان۔ ایران اور کراچی کے درمیان واقع ہے۔ میرے بیٹوں اور جانشینوں کو چاہئے کہ ہمیشہ اس کونے کی تاک میں رہیں ۞

(۲۴) مختلف ممالک کے طریق حکومت پر غور کریں اور جو طریقہ زیادہ پسندیدہ اور ملک کے حسب حال ہو۔ اسے اختیار کریں۔ میرے نزدیک بہترین اصول حکمرانی وہ ہے۔ جو دنیا کے سب سے بڑے مقنن نبی برحق محمد مصطفٰےؐ نے قائم کیا تھا۔ یہ اصول جمہوری سلطنت کا اصول تھا۔ ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ اور غلبۂ آرا کی پیروی کی جاتی تھی ۞

(۲۵) میرے جانشینوں کو چاہئے۔ کہ غیر سلطنتوں کے ہاں اپنے سفیر مقرر کریں اور ان کے سفیر اپنے ہاں رکھیں۔ مگر اس کا عمل درآمد اسی طرح بتدریج ہونا چاہئے جس طرح ریل اور تار کے سلسلہ کا ۞

(۲۶) آخر میں میں یہ کہوں گا کہ اگر خدا نے مجھے چند سال اور زندہ رکھا یا میرے بعد افغانستان خانگی جھگڑوں اور بیرونی حملوں سے محفوظ رہا اور میرے بیٹے اور جانشین میری ہدایت اور نصیحت کے موافق چلے تو دولت افغانستان کا انجام بہت اچھا ہو گا۔ اور مجھے امید ہے کہ انشا اللہ یہ دنیا میں ایک عظیم الشان سلطنت ہو گی ۞ (روزانہ پیسہ اخبار ۲ مارچ ۱۹۰۷ء)

۶۱
سیرت نبوی پر ایک نئی کتاب

(المنار سے ترجمہ)

انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر مارگیلیوس نے انگریزی زبان میں ایک مآب آں حضرت صلعم کی سوانح عمری پر تحریر کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "کہ میں محمد (صلعم) کو دنیا کے بہت بڑے لوگوں میں شمار کرتا ہوں انہوں نے قبائل عرب سے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر کے بہت بڑی پولیٹیکل گتھی کو سلجھایا۔ اور میں اُن کی کماحقہ تعظیم و تکریم کرتا ہوں لیکن میرا مقصد اس کتاب کی تالیف سے مسلمانوں یا بعض عیسائیوں کی طرح اُن کی حمایت یا جانب داری نہیں ہے۔ نہ میری یہ غرض ہے۔ کہ دینِ اسلام کی دوسرے دینوں پر فضیلت ثابت کروں۔ اور نہ یہ چاہتا ہوں۔ کہ اس کے عیوب گناؤں۔ اور اُس پر اعتراضات کی بوچھاڑ ڈالوں"۔

بعض لوگوں کو شاید یہ گمان ہو گا کہ یہ مصنف اتنی عربی جانتا ہو گا۔ کہ یورپ بھر میں کوئی اُس سے لگا نہ کھاتا ہو گا اور مسلمانوں کی بہت سی کتابیں اُس نے پڑھی ہوں گی۔ اور نکات و تاریخ اسلام پر بہت کچھ عبور حاصل کیا ہو گا لیکن اس کی کتاب کے بعض مطالب پڑھنے سے حقیقت کھل جائے گی۔ اور یہ گمان دور ہو جائے گا۔

اسلام اور اس کی تاریخ کے سمجھنے اور اہلِ یورپ کے مابین چند امور حائل ہیں۔ اول یہ کہ یورپ والے اسلام سے نفرت کرتے اور مسلمانوں کو حقیر جانتے ہیں اور یہ باتیں روزِ پیدائش ہی سے اُن کے دل پر ایسی نقش ہو جاتی ہیں کہ اُن کا اثر مدت العمر زائل نہیں ہوتا۔ دوسرے اُن کے مسلمانوں کے ساتھ مصالحِ ملکی وابستہ ہیں اور وہ از راہِ حرص مسلمانوں کا ملک ان سے چھیننا چاہتے ہیں۔ اس لئے اپنے مسلمان پڑوسیوں کی جانب سے اُن کے سینوں میں آتشِ حسد بھڑکتی رہتی ہے۔ غرض یہ سب باتیں مل کر محاسنِ اسلام کی طرف سے اُن کی آنکھوں پر پٹی

باندھ دیتی ہیں۔ با ایں ہمہ اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تقلید کی بندشوں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ مذہبی یا سیاسی تعصب سے متاثر نہیں ہوتے اور تحقیق کے رستے پر چلتے ہیں لیکن ایسے بہت ہی تھوڑے ہیں۔ تیسرے مسلمان اس زمانے میں بدحال ہیں اور اہل یورپ اُن سے دولت میں علم میں اور آبادی میں بڑھ گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود مسلمان اپنی ذات اور اپنے مذہب کے خلاف گویا ایک حجت بنے ہوئے ہیں۔ چوتھے علمائے یورپ ایک امر جزئی سے کلیات کو مستنبط کرنے غیر محسوس قرائن ضعیفہ سے بڑے بڑے مسائل حل کرنے اور مجرد عقل و فہم کے زور سے واقعات کے اسباب و علل کا کھوج لگانے میں بڑے دلیر ہوتے ہیں۔ پانچویں وہ عربی زبان اور فنون شرعیہ کی تعلیم کسی ماہر اُستاد سے حاصل نہیں کرتے۔ بلکہ اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں۔ کہ اُستاد سے پڑھا ہوا کودن سے کودن شخص بھی نہیں کر سکتا۔

ایک بار ایک یورپین مستشرق نے جو بہت بڑا عربی دان اور مسائل اسلام سے واقف سمجھا جاتا تھا میرے سامنے بیان کیا کہ "مسلمان حدیث کو قرآن پر فوقیت دیتے ہیں"۔ مجھے یہ سُن کر سخت حیرت ہوئی۔ اور اس سے اس خیال کی تائید چاہی۔ جس کے جواب میں اُس نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا۔ جو انھوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اُنہیں خوارج کے مقابلے میں بھیجتے وقت فرمایا تھا اور وہ یہ ہے:۔

لاتخاصمهم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوه تقول ويقولون ولكن حاجهم بالسنة فانهم لن يجدوا عنها محيصا الخ	اُن کے مقابلے میں قرآن سے استدلال نہ کرنا کیونکہ تم قرآن کے کچھ اور معنی لگاتے ہو اور وہ کچھ اور سمجھتے ہیں۔ بلکہ سنت کو حجت قرار دینا کیونکہ اس سے وہ ہرگز گریز نہیں کر سکینگے

میں نے کہا کہ یہاں "سُنّت" سے مراد فقہا اور محدثین کی اصطلاحی "سُنّت" نہیں ہے۔ بلکہ نبی صلعم اور صحابہؓ کا فعل مقصود ہے۔ اور یہی ایسی چیز ہے جس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس میں تاویل کا مطلق احتمال نہیں ہے۔ بخلاف حدیث قولیہ کے کہ اُس میں قرآن کی طرح بلکہ اُس سے زیادہ قیل و قال کی گنجائش ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یورپ کے مصنف کے لئے یہ امر سخت دشوار ہے کہ وہ نفوذ فی

عربیہ اور اُن کے متعلق کتابوں سے محض مطلع ہو کر اسلام کو حق فہم سمجھ سکے۔ اور خصوصاً
ایسی حالت میں جب کہ وہ مصنف منصف بھی نہ ہو۔ اور جیسا کہ آپ ہماری تنقید
میں دیکھیں گے ڈاکٹر مارگیلیوس کی اکثر غلطیوں کا سبب بھی یہی ہے کہ جس طرح
کہ مشہور ہوں اور مسروہ الفاظ سے وہ ظن و تخمین کو کام میں لا کر متقدمین کی تاریخ کا
پتہ لگاتے ہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں مصنف نے قیاسات کو بہت دخل دیا ہے
ورنہ یوں وہ بہت بڑا عالم اور اعتدال پسند ہے۔ اور زبان کے نہ سمجھنے سے جو غلطیاں
ہوئی ہیں وہ بہت تھوڑی سی ہیں۔ اب ہم اُس کے ان اقوال کو لیتے ہیں۔ جو اقرب
من الصواب ہیں۔

یہ تو ہم کہہ ہی چکے ہیں کہ اُس نے دیباچہ میں آں حضرت صلعم کو دنیا کے
برگزیدہ ترین لوگوں میں شمار کیا ہے۔ اور قبائل عرب میں ایسی عظیم الشان سلطنت
کی بنیاد ڈالنے پر حیرت ظاہر کی ہے لیکن اس کے علاوہ دو اور بہت بڑے کام
حضرت رسالت پناہ سے منسوب کیا ہے۔ اول تو یہ کہ لڑائی کے بغیر بھی عربوں
میں جو کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ اُسے یک قلم موقوف کر دیا۔ دوسرے یہ کہ جب اُن
میں جنگ چھڑ جاتی تھی۔ تو اُس کا سلسلہ سالہا سال جاری رہتا تھا۔ آپ نے
اُس کی بھی بندش کر دی۔ اور اگر جنگ کی ضرورت پڑی۔ تو اُس کا نتیجہ جلد سے جلد
حاصل کر لیا۔ اور بے فائدہ اس کا کبھی اعادہ نہیں کیا (ص ۵۵)

اُس نے اعتراف کیا ہے کہ "نبی (صلعم) شعر اور سجع سے دلی کراہت رکھتے
تھے۔ اور شاید اس کا سبب یہ تھا۔ کہ انھوں نے ان فنون کی تعلیم نہیں پائی تھی
اور عربوں میں سوائے ان کے انشا کا اور کوئی اسلوب موجود نہ تھا" (ص ۶۰) لیکن
اُس نے (سر ولیم) میور کا یہ قول بھی نقل کیا ہے (ص ۵۵) کہ "عرب کے بادیہ نشین
فن بلاغت کے سیکھنے میں بڑا اہتمام کرتے اور بات چیت میں طلاقتِ لسان کا بہت
[illegible] رکھتے تھے اس لئے کچھ بعید از قیاس نہیں ہے اگر پیغمبر (صلعم) نے بھی اس
فن میں کمال حاصل کیا ہو" میں کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلعم نے اس جانب
توجہ یا اس فن کی مشق کی ہوتی۔ تو لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا۔ اور سن شباب
میں ان کی زبان پر اس کا اثر ہوتا۔ لیکن نبوت سے پہلے کی ان کی کوئی ایسی

بات منقول نہیں ہے۔ اور نہ فصاحت و بلاغت میں اُن کی تعریف کی جاتی تھی البتہ سچائی۔ امانت اور محاسن اخلاق سے وہ بدرجۂ اتم متصف سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے دبخلاف سر ولیم میور کے، مصنف کا قول بالکل درست ہے ؛

ایک جگہ (ص ۹۳) تعریف اور نکتہ چینی کو غلط ملط کر دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "نبی (صلعم) نے اپنی قوم سے نہایت تاکید کے ساتھ فرمایا کہ کسوف و خسوف کسی فرد خاص کے لئے واقع نہیں ہوتے۔ خواہ وہ کتنا ہی عالی منزلت ہو۔ لیکن پھر بھی ان دونوں واقعات کو نہایت مہتم بالشان امر سمجھ کر ان کے لئے نماز مخصوص کی ہے"۔ مصنف کے اس قول میں نہ صرف ایک امر واقعی کا بیان ہے۔ بلکہ اُس میں خوبی کا بھی ایک بہت بڑا پہلو نکلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آں حضرت صلعم نے لوگوں کی عقلوں کو وہموں سے پاک کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ پسند نہیں کیا۔ کہ اشاعتِ باطل کے ذریعہ سے اپنی شان بڑھائیں۔ چنانچہ جس روز آپ کے فرزند ابراہیم علیہ السلام نے رحلت فرمائی اس روز سُورج گرہن پڑا تھا۔ پس لوگوں کو شبہ ہوا کہ سُورج اسی حادثہ کی وجہ سے گہنایا ہے۔ لیکن آپ نے صاف فرما دیا۔

ان الشمس والقمر اٰیتان من اٰیٰت الله وانهما لا یکسفان لموت احد ولا لحیٰوته ؕ	چاند سُورج خدا کی (بے شمار) نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ اور وہ کسی کے مرنے جینے سے نہیں گہنا سکتے ؛

کسوف و خسوف کے وقت نماز کا حکم اس وجہ سے دیا ہے کہ دینِ اسلام کی سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ خدا کی قدرت و حکمت کا ذکر کیا جائے۔ اور شکر و دعا کے ذریعے سے دل کو اس کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اور یہ غرض مظاہر قدرت کے واقع ہونے کے وقت بوجہ احسن حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی بات پنج گانہ نماز میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کیونکہ آفتاب کا طلوع ہونا پھر ڈھلنا۔ پھر قریب بہ غروب ہو کر غائب ہو جانا یہاں تک کہ اس کی رُوشنی کا ذرا بھی باقی نہ رہنا خدا کی قدرت کے قوی اور کامل ترین نمونے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ باران کے وقت ذکر الٰہی کی تعلیم فرمائی ہے۔ اسلام لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ اس کی قدرت و حکمت کے بہترین کرشمے کے ظاہر ہونے کے وقت اُسے یاد کیا جائے۔ تاکہ بندے اُسے بھول

نہ جائیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اُن پر حیوانیت غالب ہو جائے۔ اور وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے لگیں ؛

ڈاکٹر مارگیلیوس نے نبی صلعم کے خصائص کا اعتراف کیا ہے لیکن اپنی طرف سے بہت کچھ زور لگانے پر بھی اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ چنانچہ (ص ۹۳ میں) کہتا ہے کہ "اسرار کے معلوم کرنے کے اُن (صلعم) کے پاس ایسے وسائل موجود تھے۔ جن کی حقیقت دریافت کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ یہ بات تجربہ سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ انہیں طبیعت ہی ایسی ودیعت کی گئی تھی۔ جس پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کے ذریعے سے وہ لوگوں کی طبیعتوں کو جا پہنچنے میں بہت کم بلکہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے" ہم کہتے ہیں کہ خدا نے انہیں ایسی طبیعت اس لئے بخشی تھی۔ کہ لوگوں کی ہدایت میں وہ اُس سے مدد لیں۔ اور نبوت کیا ہے ؟ نبوت بھی ایک تخصیصِ الٰہی ہے۔ جس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے۔ کہ لوگوں کو سیدھے رستے پر اور تاریکی سے روشنی میں لایا جائے۔ پس اس میں تعجب اور حیرت کی کون سی بات ہے ؛

اسی قبیل سے ایک اور عقدہ ہے جس کے حل کرنے سے ڈاکٹر مارگیلیوس باایں ہمہ علم و فضل سخت عاری ہے یعنی یہ کہ آن حضرت صلعم کے دعوے نبوت کے آغاز کا سبب کیا ہے ؟ خود مصنف کے الفاظ یہ ہیں "مشہور ترین لوگوں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے کارہائے عظیم کے آغاز کے ضرور ایسے اسباب تھے جو اس کے محرک ہوئے۔ لیکن اس پیغمبر (صلعم) کی نسبت مطلق معلوم نہیں کہ اُن کے دعوے نبوت کی شروعات کا سبب کیا تھا" (ص ۷۲) اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ اگر یہ کام ایسا ہوتا جیسا ملکوں کے فتح کرنے یا سلطنتوں کے قائم کرنے کا ہوتا ہے۔ تو یہ بات غیر ممکن تھی۔ کہ کوئی عقل مند آدمی بغیر قدرتی اسباب کے مہیا ہوئے جن سے کامیابی کا یقین یا گمان ہو سکے۔ اس کا اقدام کرے۔ لیکن نبی صلعم اگر ایک ایسے عظیم الشان کام کے لئے (جو ملک گیری اور ملک داری سے کہیں بڑا ہے) بغیر کسی سامانِ قوت اور قدرتی اسباب کے (جیسے دولت و جمعیت۔ یار و مددگار) جن سے کامیابی کی امید بندھ سکے۔ کھڑے ہو گئے۔ تو ایں

ہیں ذرا بھی تعجب کا موقع نہیں۔کیونکہ آپ کو اُس ذات پر بھروسا تھا۔جو سبب اور مسبب کا مہیا اور آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔جس نے انھیں دعوت اسلام کا حکم دیا۔اور اُن کی مدد کی۔بلکہ یہی آپ کی سچائی اور من جانب اللہ ہونے کی بہت بڑی اور کافی دلیل ہے۔مصنف کہتا ہے (ص ۴۷) کہ "پیغمبر (صلعم) کی عظمت کے دو سبب ہوئے۔اوّل تو وہ تاڑ گئے۔کہ قوم عرب کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ اس ادراک کو انہوں نے پُر اثر بنایا" لیکن نبوت کے معاملے میں اس قسم کے کسی سوچ بچار اور عمل و تدبیر سے کام نہیں لیا گیا۔کیونکہ ایسا ہوتا۔تو اس سے یہ بات لازم آتی تھی۔کہ قدرتی اسباب سے فائدہ اُٹھایا گیا۔مگر اس کا ابھی ذکر ہوچکا ہے کہ یہ صورت ہرگز پیش نہیں آئی ۔

مصنف لکھتا ہے (ص ۸۰) کہ "دو سوال ایسے ہیں۔جن کا جواب دیا جانا ممکن نہیں۔اوّل یہ کہ اس عربی نژاد شخص محمد (صلعم) کو نبوت کا خیال کیسے پیدا ہوا اُن کے سوا اور لوگوں کو کیوں پیدا نہ ہوا؟ دوسرے یہ امر متحقق ہے کہ اُن کے اندر صبر عزم اور قوتِ ارادی اعلیٰ ترین درجے کی تھی۔پس یہ اوصاف انھیں کیسے حاصل ہوئے؟ اور یہ ویسی ہی بات ہے۔جیسی کارلایل ٹیوبل کین کی نسبت کہا کرتا تھا کہ پانی پہلے بھی کھولتا تھا۔اور لوہا قدیم سے موجود تھا۔مگر ایسا کوئی نہ ہوا جو بھاپ کی کلیں ایجاد کرتا" بھاپ کی کلیں ایجاد کرنے اور نبوت میں بہت بڑا بل ہے۔جسے مصنف معلوم نہیں کر سکا۔مثلاً جس شخص نے اوّل یہ خیال کیا کہ بھاپ ایک ایسی قوت ہے۔جسے چیزوں کے اُٹھانے اور پھینکنے کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگی۔کہ آئندہ اس کے ذریعے سے انسان خشکی و تری پر سفر کرنے لگیں گے۔البتہ اگلوں کی ایجادوں پر اضافہ کرتے کرتے پچھلے اس نتیجے پر پہونچ گئے۔لیکن نبوت کی حالت پر غور کیجیے۔ایک ہی شخص (صلعم) نے دعوےٰ کیا۔اسی نے شریعت بنائی پھر اُسی نے اس شریعت کو کتاب اور عمل کے ساتھ مستحکم کیا۔اور لوگوں کو ایک غیر معمولی اور دُوراز فہم کشش کے ساتھ اپنی طرف کھینچا۔یہاں تک کہ اُس کا دین مکمل ہوگیا اور ایک قوم پیدا ہوگئی۔جس نے اُس کی ہدایتوں پر چل کر عظیم الشان سلطنت

کی بُنیاد ڈالی اور بڑے بڑے شہر بنا کر کھڑے کر دئے ۔

ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ "وہ اس کام کے لئے بہت سی فکر و تدبیر کے بعد آمادہ ہوئے تھے۔ اور لوگوں سے تعلیم حاصل کرتے اور ان کے علم سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اور جو کچھ اس طرح سیکھ لیتے تھے۔ اس کی نسبت دعوےٰ کرتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی ہے۔" لیکن دوسری جگہ (ص ۱۴۷) لکھا ہے "نبی (صلعم) دل سے اس بات پر یقین رکھتے تھے۔ کہ انبیائے بنی اسرائیل کی طرح میں بھی ایک نبی ہوں۔" (سچ ہے حق بر زباں جاری)۔

ایک اور بات ہے۔ جس کے سمجھنے سے وہ قاصر رہا ہے اور لکھا ہے۔ (ص ۲۰۹) کہ "نبی (صلعم) کے پاس کچھ ایسے مخفی وسائل تھے۔ جن کے ذریعے سے وہ خبریں عجیب و غریب سُرعت کے ساتھ حاصل کر لیا کرتے تھے۔" اس سے مصنف کی مُراد سرورِ کائنات (صلعم) کے وہ اقوالِ شریفہ ہیں۔ جو آپ وحی والہام کے ذریعے سے فرماتے تھے۔ اگر آپ کے پاس ایسے پوشیدہ ذرائع ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اُن کثیر التعداد ذکی و ذہین لوگوں سے چھپے رہتے۔ جو ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ اگر یہ لوگ اس قسم کی کسی بات کی بھنک بھی پا لیتے تو یہی ایک سبب اُن کی کنارہ کشی کے لئے کافی ہو جاتا۔ اور وہ آپ کی دعوت پر یوں ٹوٹ کر نہ گرتے۔

صفحہ ۲۵۸ میں اس پر بے حد مدح و ثنا کی ہے کہ "نبی (صلعم) نے ظلم و ستم اور تمثیل (ناک کان کاٹنا) سے پہلے ہی منع کر دیا تھا۔ حالانکہ یورپ نے ان باتوں کو حال ہی میں ناجائز قرار دیا ہے۔" یورپ نے اپنے ہاں اسے اس وجہ سے ممنوع ٹھیرا دیا کہ قوم قوی ہو جائے لیکن کبھی کبھی غیر ملکوں میں تو اب بھی اسے مباح سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں۔ تو جو عظمت اُنہیں اس وقت حاصل ہے وہ سب خاک میں مل جائے ۔ (علی گڑھ منتھلی مارچ سنہ ۱۹۰۶ء)

(۶۴۳)

اسلام کا زمانۂ آئندہ

اس زندگی کی کشمش کے زمانہ میں جہاں افراد افراد سے اور قومیں قوموں سے بڑھ جانے کی کوشش میں ہیں۔ وہیں مختلف مذاہب بھی ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن جن دو مذہبوں کا مقابلہ نہایت سخت ہے وہ اسلام اور عیسویت ہیں۔ ایک طرف مسلمانوں کے انحطاط نے اسلام کو بھی دنیا کی نظر میں بے وقار کر دیا ہے۔ دوسری طرف مذہب عیسوی سلطنت کے بل پر کود رہا ہے۔ پادری جب وعظ کو کھڑے ہوتے ہیں۔ تو مسلمانوں کے تنزل اور عیسائیوں کی ترقی کا مقابلہ کر کے دکھاتے ہیں۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ اسلام اب زندہ نہیں ہے۔ اور قریب تر زمانہ میں وہ صفحۂ ہستی سے خدانخواستہ نابود ہو جائے گا۔ اور ساری دنیا" مسیح کی بھیڑوں کے گلے" میں داخل ہو جائے گی۔ کیونکہ قوموں اور مذہبوں کے گرنے کے یہی معنی ہوا کرتے ہیں۔ کہ ان کے لئے اب سوائے منزلِ عدم کے اور کوئی مرحلہ باقی نہیں رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہر بین اور دنیا طلب طبایع پر اس مقابلہ کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا ہے۔

مخالفان اسلام کے واسطے ایک طرف تو یہ دل خوش کن خیالات ہیں لیکن دوسری طرف علمائے عالم کا ایک انبوہ کثیر اسلام کو ایک مردہ مذہب تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کرتا ہے۔ بلکہ اُسے روبہ ترقی بتاتا ہے۔ اس دعوے کی تصدیق ہمیں اس وقت بخوبی ہو جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی دنیا پر "زرد خطرہ" سے بدرجہا زیادہ "اسلامی خطرہ" کا خوف طاری ہے۔ کیونکہ چین اور جاپان تو صرف ایشیا کے ایک گوشہ میں ہیں لیکن اسلام سمندر کے پار دنیا کے ہر حصہ میں پھیلا ہوا ہے۔ پھر چین کی آبادی کا ایک معتدبہ حصہ مسلمان ہے اس طرح گویا "اسلامی خطرہ" "زرد خطرہ" کے اندر بھی گھسا ہوا ہے غرض کہ باوجود مسلمانوں کے اس ضعف کے دنیا اسلام کی قوت سے غافل نہیں

عالم ز ماتہی و ز افغان اپست　شد عندلیب خاک و چمن از نوا پرست

عیسائی مشنری محفل کا رنگ جمانے کے لئے جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ تو میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔ مگر یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ جو لوگ مذہبی تعصبات سے مبرا ہیں ان کی اس باب میں کیا رائے ہے؟

اس غرض کے لئے میں اول پروفیسر مارگیلیوس کے جو بہت بڑا یورپین مستشرق ہے ایک مضمون کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ یہ مضمون پروفیسر موصوف نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھا تھا۔ اور اس کا خلاصہ مصر کے مشہور عربی رسالہ "الہلال" نے چھاپا ہے۔ اس مضمون کی وقعت یہ دریافت کرنے سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ "الہلال" کا ایڈیٹر بھی ایک عیسائی عالم جرجی زیدان آنجہانی ہے۔ اور جن الفاظ کے ساتھ علامہ زیدان نے اس مضمون کو اپنے رسالہ میں جگہ دی ہے اس کا اندازہ آپ کو آئندہ سطور سے ہو جائے گا:۔

پروفیسر مارگیلیوس بہت بڑا مستشرق ہے۔ تاریخ اسلام کے متعلق اس کی اطلاع نہایت وسیع ہے اور وہ یورپ میں عربی زبان کے ماہرین میں سے ہے اس کی عربی تحریر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا لکھنے والا عربی زبان کا بہت بڑا عالم ہے۔ کیونکہ اس میں بلاغت و متانت کے علاوہ عجمیت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ دیگر السنہ مشرقیہ کا بھی فاضل ہے۔ پروفیسر مذکور نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن سے اس کی اعتدال پسندی اور دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ حال میں ہمارے پاس "فیوچر آف اسلام" (مستقبل الاسلام) کے عنوان سے ایک انگریزی رسالہ پہنچا ہے۔ جو اس نے ایک بہت بڑے علمی مجمع میں پڑھا تھا۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ اس کا خلاصہ اپنے ناظرین کے روبرو پیش کریں۔ تاکہ اس مہتم بالشان مسئلہ کے متعلق اس عالم کی رائے انہیں معلوم ہو جائے۔ وہ لکھتا ہے:۔

چند روز ہوئے مشہور مورخ مسٹر بالفس نے اپنے ایڈریس میں بیان کیا تھا کہ "اسلام کی تحریک ... رو گئی ہے۔ لوگوں کو یہ حسن کر سخت

تعجب ہوا تھا کیونکہ جاننے والوں کے نزدیک یہ رائے مجنوں کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اگرچہ ہم مسلمانوں کی پوری تعداد نہیں بتا سکتے لیکن وہ دس کروڑ نفوس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اسلام ایشیا اور افریقہ میں پھیلا ہوا اور یورپ و امریکہ میں موجود ہے۔ اور ابھی تک اس میں کوئی ایسی علامت ظاہر نہیں ہوئی جس سے اس کے مٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ انیسویں صدی میں اسلام کے متعلق ایک عالم نے لکھا تھا۔ کہ ”صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو اس وقت چین اور ہندوستان میں ترقی کرتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ ورنہ خود ان کے دوسرے قدیم مذاہب رو بانحلال ہیں“ ایک بلند پایہ مستشرق لکھتا ہے کہ ”اسلام عن قریب کل ہندوستان پر چھا جائے گا۔ کیونکہ کثیر التعداد ہنود اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے جاتے ہیں۔ تاکہ اپنے مذہب کی ناگوار قیود سے آزاد ہو جائیں“ ایشیا کے متعلق مباحث کے سلسلہ میں سر الفرڈ لائل نے سنہ ۱۸۹۶ء میں تحریر کیا تھا کہ ”حال میں بلاد چین کے اندر اسلام اس قدر پھیل گیا ہے۔ کہ اہل یورپ کی نظریں اس کی جانب اٹھ رہی ہیں۔ اور وہ خائف ہیں کہ کہیں وہ سلطنت کا مذہب نہ ہو جائے۔ اور پھر ازمنہ مظلمہ کی طرح وہ یورپ والوں سے صلیبی جنگ پر کمربستہ نہ ہو جائیں۔“ اگرچہ اس اندیشہ کی تصدیق نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ چین میں مسلمانوں کو قوت بہت حاصل ہے۔ چنانچہ وہاں کی نسبت ایک یورپین سیاح نے لکھا ہے کہ ”یہاں معمولی سی بات کے لئے بھی مسلمانوں کا جمع ہونا خطرناک سمجھا جاتا ہے“ افریقہ میں بھی اسلام بسرعت تمام پھیل رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ افریقہ سے عقائد وحدیت کے فرو ہونے کے ساتھ ہی اسلام بھی چلتا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ ترقی کی یہ رفتار قائم نہ رہے۔ مگر افریقہ میں اسلام کو زوال ہرگز نہ ہوگا۔

عیسائی پادری بلاد اسلامیہ کے متعلق ایسی ہی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ جیسی برائس کی رائے ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۰ء میں ایشیائے کوچک کے متعلق ایک پادری نے لکھا تھا کہ ”علم و تمدن اور مسیحیت کے مقابلہ میں اسلام عن قریب برف کی طرح پگھل جائے گا۔“ ڈاکٹر براؤن نے عرب اور افریقہ کے متعلق اپنی کتاب

میں لکھا ہے کہ "بعض عربوں نے مجھ سے کہا کہ اسلام بھی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ فنا ہو جائے گا" حالات سیاحت ۱۸۸۰ء میں لنسر نے بیان کیا ہے کہ "اگر اسلام کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ تو البتہ وہ باقی رہے گا لیکن اگر وہ تہذیب کے مقابلہ میں لایا جائے۔ تو لامحالہ مرجائے گا" اسی قبیل سے اور بہت سی رائیں ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں ان کثیر التعداد لوگوں کے اقوال بھی ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک غیر متناہی زمانہ تک باقی رہے گا۔

میں نہیں چاہتا کہ ان تمام آراء و اقوال میں سے کسی کی تصدیق یا تکذیب کروں۔ کیونکہ آئندہ کا حال سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ لیکن میں اس بحث کی پابندی کروں گا۔ کہ زوال اسلام کے مخالفین کیا معنی لیتے ہیں۔ اور اسباب زوال اسلام سے کیا مراد ہے۔ اس لئے میں ان خاص واقعات کا ذکر کروں گا۔ جو اثنائے سیاحت بلاد اسلامیہ میں میری نظر سے گزرے تھے۔ میں اُن فرنچ علما کے چشم دید حالات کی جانب بھی اشارہ کروں گا۔ جنہوں نے مشرق میں اپنی عمریں بسر کردی ہیں۔ جو لوگ سرعت زوال اسلام کے قائل ہیں۔ وہ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ یہودیت و مسیحیت یا دوسرے مذاہب کے خلاف اسلام ان اسباب سے خالی ہے۔ جن کی مدد سے وہ زندگی کے معرکہ میں قایم رہ سکے ۱۸۸۰ء میں ایک جرمن عالم بیشون نامی نے اس امر کے متعلق کہ اسلام کا اثر اُس کے پیروؤں پر کیا پڑتا ہے۔ لکھا تھا کہ "قسطنطنیہ میں تمام وہ کام جن میں فہم و ذکا کی ضرورت ہے۔ یورپین عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جہازراں کمپنیوں کے مالک یونانی۔ ارمنی۔ فرانسیسی۔ جرمنی اور روسی ہیں۔ عثمانی جہازات کا بیڑہ انگریز افسروں کی نگرانی میں ہے۔ عثمانی لشکر میں جرمنی۔ فرانسیسی اور انگریز افسر ہیں۔ ریلوے کو جرمن۔ انگریز اور فرانسیسی انجنیر چلاتے ہیں۔ اور محکمہ تار میں ہالینڈ اور اٹلی والے بھرے ہوئے ہیں" اس تحریر سے بیس سال بعد مسٹر ڈولی نے لکھا تھا کہ "قسطنطنیہ میں مسلمان یا تو لکڑیاں کاٹتے ہیں۔ یا سقائی کرتے ہیں۔ یا بے کار پڑے رہتے ہیں۔ یا کرایہ پر گدھے چلاتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں تو بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر۔ عثمانی لشکر تو بالکل عیسائی افسروں کے ہاتھ میں ہے" مسٹر ڈولی

نے بھی رائے دیگر عثمانی محکموں کے متعلق دی تھی۔ اور اس حکم کا اطلاق تمام بلاد اسلامیہ خصوصاً ایران پر کیا تھا۔ اور اس حالت کو خود اسلام کی جانب منسوب کرکے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اسلام تمدن کی روح کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے جلد معدوم ہو جائے گا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس مسئلہ کو جس نظر سے ان لوگوں نے دیکھا ہے۔ وہ اس سے زیادہ گہری نظر سے دیکھے جانے کا محتاج ہے۔ کیونکہ جن مشرقی ملکوں میں جدید تمدن ابھی داخل نہیں ہوا۔ مثلاً حبش کا ملک۔ وہاں مسلمان باوجود عیسائی سلطنت کے ماتحت ہونے کے عیسائیوں سے تہذیب و شائستگی میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۳۹ء میں رربل نے اپنی سیاحت حبش کے ذیل میں لکھا ہے کہ "حبش کے مسلمان یہاں کے عیسائیوں سے کاروبار میں بہت آگے ہیں" اسی قسم کی رائے ۱۸۹۸ء میں وان ہوگلین نے دی تھی ؟

میرے پاس اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کہ مذہب کو قوموں کی ترقی و تنزل سے بہت کم تعلق ہے۔ بہت سی دلیلیں ہیں۔ مگر اس مسئلہ پر ایک اور بھی پہلو سے بحث کرنی چاہئے۔ جو اس پہلو سے بالکل مختلف ہو۔ جس کو بیشون اور ڈوزی نے اختیار کیا ہے ؟

خیال کرنا چاہئے کہ بعض اسباب تو ایسے ہیں۔ کہ ذرا غور سے واضح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بعض غیر قوموں کی ترقی کو اہل یورپ کے ساتھ میل جول سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ سبب سوشیل ہے۔ نہ کہ مذہبی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مراکش میں از روئے معاہدات ممالک غیر کے سفیروں کی حفاظت کی جاتی ہے لیکن اس سے بہ نسبت مسلمانوں کے یہودیوں کو فائدہ زیادہ پہنچتا ہے کیونکہ بخلاف مسلمانوں کے یہودیوں کے تعلقات یورپ میں بڑھے ہوئے ہیں۔ یا مثلاً ایران میں عیسائی مسلمانوں سے آگے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ ایرانی یورپ کے اخبارات سے ڈرتے ہیں۔ پروفیسر ومبری نے ۱۸۷۵ء میں انیسویں صدی کے اسلام کے متعلق لکھا تھا کہ "قسطنطنیہ میں مسیحیوں کے مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہونے کا سبب یہ ہے کہ مسیحیوں کو فوجی خدمت انجام دینی نہیں پڑتی اور وہ اطمینان سے

عام کاروبار میں مصروف ہو سکتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو شہر بلکہ ملک چھوڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے"۔

اس پر یہ اور اضافہ کرنا چاہئے کہ مسلمان اپنی ترقی کے زمانہ میں بھی یہودی اور عیسائیوں کو پولیٹکل معاملات میں دخل دیتے اور ان کو اعلےٰ عہدوں پر ممتاز کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے نزدیک بحیثیت رعایا ذمی اور مسلمان برابر تھے اور یہی دستور اسلامی سلطنتوں میں اب بھی جاری ہے کہ وہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زمانہ کی رفتار نے عیسائیوں کو متمدن کر دیا۔ اور وہ کاروبار میں مسلمانوں سے سبقت لے گئے۔ میں مسلمانوں کی ایک ایسی بہت بڑی جماعت سے واقف ہوں جو فہم و فراست۔ جرأت و ہمت۔ لیاقت و صداقت۔ غرض کہ تمام اعلےٰ انسانی اوصاف میں بالکل مکمل ہے۔ میرے اعتقاد میں پروفیسر ویمبری کی یہ رائے نہایت مستحکم ہے کہ یورپ و ایشیا کے اختلاف تمدن کا سبب مسیحیت اور اسلام نہیں ہے بلکہ یورپ اور ایشیا والوں کے قوٰی اور مواطن ہیں۔ میرے نزدیک ان لوگوں کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ عن قریب عیسائیت اسلام کی جگہ لے لیگی۔ کیونکہ اُن کے خیال میں عیسائی مذہب جدید تمدن کے موافق ہے اور اسلام اس کے موافق نہیں ہے۔ جب ہم ایک طرف عیسائیوں کی مذہبی سوسائٹیوں کو جو مسلمانوں کے درمیان اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کی ناکامی کو دیکھتے ہیں۔ تو ہم قائل ہو جاتے ہیں کہ اسلام روبتنزل نہیں ہے"۔

مشہور سیاح سیون ہیڈن نے اپنے ایشیائی سفر کے حالات میں لکھا ہے کہ "کاشغر میں عیسائی مشنریوں کی کوششیں سخت ناکام رہی ہیں"۔ اس نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ "میں ان مشنریوں میں سے تین سے ملا ہوں۔ ایک نے مجھ سے کہا کہ مجھے یہاں کام کرتے دس سال ہوئے۔ مگر ایک مسلمان بھی عیسائی نہیں ہوا۔ اور یہی حالت میرے ساتھیوں کی ہے"۔ مگر ایران کے متعلق ڈاکٹر ایڈمز نے لکھا ہے کہ "یہاں مسلمانوں کے عیسائی ہونے کا سبب

بانی مذہب ہوا ہے۔" ہندوستان میں مشنریوں کو کامیابی ہوئی ہے۔ مگر یہاں مسلمان ہونے والوں کی تعداد عیسائی ہونے والوں سے کم نہیں ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ مسلمانوں میں اپنے اسلاف پر فخر کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔ اس لئے اُن ممالک میں جہاں اسلامی سلطنت رہ چکی ہے۔ مشنریوں کو کامیابی کم ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال محض لچر ہے۔ کیونکہ ان کے زوال سلطنت کو مدت دراز گزری اور اس وقت چھ حصوں میں سے پانچ حصے مسلمان غیر اسلامی حکومتوں کے ماتحت ہیں۔ ان پانچ حصوں میں سے آدھے تو انگریزوں کی رعایا ہیں اور باقی روس و فرانس وغیرہ کی۔

یہ سچ ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کی حالت متغیر ہو گئی ہے۔ لیکن وہ باقی ضرور ہے۔ کیونکہ وہ نئے علم و تمدن کے بالکل مطابق ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی اندیشہ نہیں ہے۔ کہ یہ پولیٹکل انقلابات اُسے کچھ صدمہ پہنچا سکیں۔ اب مسلمان علما کی ایک جماعت اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ جو علم و مذہب کی تطبیق کرتی ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے یورپین علما سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے مرض کو پہچان کر علاج شروع کر دیا ہے۔ اس واسطے کامل یقین ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں روز بروز قوی ہوتا جائے گا۔

یہاں ڈاکٹر مارگیلیوس کا مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد میں انگلستان کے مشہور فاضل اور دینی پیشوا مسٹر آئزک ٹیلر کی رائے کا اقتباس بھی پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جو حسب ذیل ہے:- "اسلام دنیا کے بڑے حصہ میں بطور ایک واعظ مذہب کے بہ نسبت مذہب عیسوی کے زیادہ تر کامیاب ہے۔ نہ صرف بُت پرستی سے نفرت کر کے اسلام پر ایمان لانے والے بہ نسبت عیسائی مذہب پر ایمان لانے والوں کے زیادہ ہیں۔ بلکہ عیسائی مذہب بھی بعض ممالک میں درحقیقت اسلام کے سامنے سے ہٹتا جاتا ہے اور مسلمان قوموں کو مذہب عیسوی کا معتقد بنانے کی کوششیں بظاہر بالکل ناکام ہوتی ہیں۔ مذہب اسلام وسط افریقہ میں بڑی سرعت سے پھیلتا جاتا ہے۔ اور بڑی تیزی سے خط استوا کے جنوب کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ ہندوستان میں یورپین تہذیب

جو ہندو مذہب کو دور کر رہی ہے۔ وہ اسلام کے لئے ایک نیا راستہ تیار کررہی
ہے۔ اسلام نے تہذیب پھیلانے میں مذہب عیسوی سے بہت زیادہ کوشش
کی ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں مشنریوں کے بیانات سے کسی قدر بدگمان
ہوں۔ لیکن ذرا انگریزی عہدہ داروں اور سیاحوں کے جو پادری نہیں ہیں
مثلاً ٹن پوپ ہینسی۔ گیلٹن۔ پال گریو۔ طامسن۔ ریڈ وغیرہ، بیانات کو ملاحظہ
کرو۔ جو کہتے ہیں کہ جب وقت ایک حبشی اسلام قبول کرلیتا ہے بت پرستی۔
جنّات پرستی۔ مخلوق پرستی مردم خواری۔ انسانی قربانی۔ اطفال کشی اور
جادوگری اس سے فوراً دور ہو جاتے ہیں۔ وحشی کپڑے پہننے لگتے ہیں۔ اُن
میں کثافت کی جگہ صفائی آجاتی ہے اور وہ ذاتی شرافت اور خودداری حاصل
کر لیتے ہیں۔ اس مذہب کے برائی سے روکنے اور تہذیب پھیلانے کے اثر بالکل
عجیب ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں تنخواہ دار واعظ نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی بڑی
جماعت ان میں اس قسم کی ہے۔ جو اپنے مذہب کے پھیلانے میں سرگرم رہتی
ہو۔ پس چھ لاکھ نومسلموں کی بڑی تعداد کچھ تو پرجوش مسلمانوں کی انفرادی
کوششوں کا اور کچھ مذہب اسلام کی حقیقی کششوں کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس
کے باوجود اس تمام رعب وداب کے جو عیسائیوں کو اپنی ہم مذہب گورنمنٹ
کی طاقت وجبروت سے حاصل ہے اور باوجود اس رقم کثیر کے جو مشنری
سوسائٹیوں پر صرف ہوتی ہے۔ کل تعداد نئے عیسائیوں کی بڑی کھینچا تانی
سے دسواں حصہ مسلمانوں کی تعداد کا ہے۔ ان دو نہایت باوقعت اور وزن دار
رایوں کے بعد جو بجائے خود بہت سی معتبر رایوں کا مجموعہ ہیں۔ مذہب اسلام
کے زمانہ آئندہ کی دل فریبی کے متعلق غالباً کسی کو شبہ باقی نہیں رہ جائے گا
لیکن یہ بات زیادہ تر خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ کہ وہ اپنے مذہب کی نسبت
اس کے بہی خواہوں کی خوش نما امیدوں کو پورا کریں۔ (علی گڑھ گزٹ ۲
جولائی سنہ ۱۹۰۷ء)

۶۲

بچوں کی نیند

(ترجمہ تدبیر الاطفال)

حال کے پیدا ہوئے بچے سوائے دودھ پلائے جانے اور کپڑے بدلے جانے کے وقتوں کے دن رات کے بڑے حصے میں سوتے رہتے ہیں جس کا اوسط اٹھارہ انیس گھنٹہ ہے۔ جتنی عمر بڑھتی جاتی ہے۔ اتنی ہی نیند گھٹتی جاتی ہے۔ چنانچہ سال بھر کا بچہ ۱۵-۱۶ گھنٹے سوتا ہے۔ دو تین سال کا بارہ تیرہ گھنٹہ۔ چار پانچ سال کا دس گیارہ گھنٹہ۔ اگر بچہ اس سے کم سوئے تو سمجھنا چاہئے۔ کہ اُس کی تندرستی میں فرق ہے۔ یا اسے وقت پر سلایا نہیں جاتا دوسرے مہینے سے بچے کو رات میں سونے کے اصل وقت سے ایک گھنٹہ بعد سُلایا جاوے۔ تاکہ رات بھر گہری نیند سوتا ہے ؛

ماں کو چاہئے کہ بچے کو ٹھیک وقت معینہ پر سلا دے۔ لیکن اگر بچے ‎[کو] نیند کم آتی ہو۔ تو اس کا علاج افیون یا اور کوئی مسکر چیز کھلا کر نہ کریں ‎[ک]یونکہ اس سے بچوں کے کمزور جسموں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اکثر مائیں ‎[ی]ہ بھی کرتی ہیں کہ بچے کو گود میں لے کر اچھالتی یا دائیں بائیں جھلاتی یا ‎[ل]ٹا کر تھپکتی یا چارپائی ہلاتی ہیں۔ غرضکہ سلانے کے لئے طرح طرح کے ذریعے ‎[ک]ام میں لاتی ہیں۔ لیکن یہ سب نقصان پہنچانے والے ہیں۔ کیونکہ اس ‎[س]ے نہ صرف ماں کو جس کا بچہ دودھ پیتا ہے۔ بلکہ بچے کو بھی تھکن پیدا ہوتی ‎[ہ]ے۔ بہتر یہ ہے کہ ان کے علاوہ اور کسی طرح بچے کو سلائیں۔ اور اپنے اوپر ‎[تھ]وڑی سی تکلیف گوارا کر کے اُس کے سونے کا صبر کے ساتھ انتظار کریں

‎[پہ]لے پہلے مہینے میں بچے کو ہمیشہ چت لٹانا چاہئے اور اس کے بعد اگر کچھ ‎[دیر] اگر بچے کو کروٹ سے یا پیٹ کے بل بھی لٹا دیا جائے۔ تو کچھ ہرج نہیں ‎[بل]کی مفید ہے۔ لیکن اگر بچے کو ہڈیوں کی نرمی کا مرض ہے۔ تو ہر وقت ‎[چت]تمام سے لٹانے میں ڈر ہے۔ کہ اس کی پیٹھ ٹیڑھی نہ ہو جائے۔ اور پھر ہے ؛

کھانے کی طرح سونے کے وقت بھی مقرر ہونے چاہئیں۔ رات کے وقت بچے کو دودھ پلانے کے لئے ایک بار یا دو بار سے زیادہ نہ جگانا چاہئے بلکہ بغیر مانگے رات کے وقت دودھ دینا بھی نہیں چاہئے۔

بچے کا اوڑھنا بچھونا صاف ستھرا نرم اور کشادہ ہونا چاہئے۔ تاکہ ہوا آسانی سے پہنچ سکے۔ کیونکہ بچوں کو ہوا کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی بڑوں کو۔ بچوں کو ہوا سے بچانے کے لئے بھاری بھاری اوڑھنوں سے ڈھکنا سخت غلطی ہے۔

بچے کا پلنگ پٹیوں کی طرف سے اونچا ہونا چاہئے۔ تاکہ بچے کے گرنے کا ڈر نہ رہے۔ ماں کا بچے کے ساتھ ایک پلنگ پر سونا سخت خطرناک ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ماں نیند میں بچے پر لوٹ پڑے اور بچہ کچل جائے یا ماں کا اوڑھنا بچے پر جا پڑے۔ اور اس کا دم گھٹ جائے۔ علاوہ بریں یہ اصول حفظان صحت کے لحاظ سے بھی مضر ہے۔ اس میں ایک اور خرابی یہ ہے کہ ماں کے ساتھ سونے کی حالت میں جب بچہ چونکے گا۔ تو ماں ضرور دودھ پلائے گی۔ اور اس سے بچے کے ہضم میں فتور آئے گا۔

بچوں کے کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے رکھنے چاہئیں اور اوڑھنے بچھونے (سوائے گرمیوں کے) ہر روز دھوپ میں ڈالنے یا آگ سے سینکنے چاہئیں۔ دن کو بچہ جو کپڑے پہنے رہا ہو وہ رات کو اتار دینے چاہئیں۔ بچے ذرا سمجھدار ہو کر کپڑے بدلنے میں ضد کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ماؤں کو چاہئے کہ بہلا پھسلا کر یا ضرورت ہو تو جبراً کپڑے بدلوائیں۔

سونے کے مکان کے متعلق یہ ہے کہ وہ ماں کی سونے کی جگہ سے علیحدہ ہونا چاہئے اور بچہ اور اس کی کھلائی ایک کمرے میں رہیں اور جس وقت بچے کو دودھ پلانا چاہیں۔ اسے ماں کے پاس لے جائیں۔ اور ماں کا دودھ نہیں پیتا۔ بلکہ دائی کا یا چسکی اور بتی سے پیتا ہے۔ تو ماں کی موجودگی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی بہتر یہ ہے۔ کہ بچے کے کام ماں کی موجودگی میں ہوں۔ (خاتون۔ جون ۱۹۰۶ء)

۶۵

مریخ کے ساتھ گفتگو

(۱) کب ہوگی؟ (۲) کس زبان میں ہوگی؟ (۳) کیسے ہوگی؟

علمائے فلکیات نے اجرام سماویہ میں سب سے زیادہ مریخ کے مطالعہ پر جو ہمت صرف کی ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ بالکل ابتدائی وجہ تو یہ ہے۔ کہ مریخ ہر دو سال بعد زمین کے مقابل ہوتا ہے۔ جس سے اس کے مطالعہ کر سکنے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ یہ وجہ تو ہمیشہ سے چلی آتی تھی لیکن ۱۸۷۷ء میں میلان (اٹلی) کے نامور اور محقق فلک دان پروفیسر شیپارلی نے یہ امر دریافت کر کے دنیا کو مریخ کی جانب اور بھی زیادہ متوجہ کر دیا کہ مریخ کی سطح پر جو باریک باریک متوازی اور متقاطع خطوط نظر آتے ہیں۔ وہ درحقیقت نہریں ہیں۔ جن کی تعمیر صرف ذی شعور ہاتھ سے ممکن ہے۔ بعد کے مطالعوں نے پروفیسر شیپارلی کے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہنچایا ہی تھا۔ کہ یکایک بیسویں صدی عیسوی نے اپنا منہ ایک نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز انکشاف پر کھولا۔ اور پروفیسر ڈگلس نے جو امریکا کے فلک دانوں میں بے مثل خیال کیا جاتا ہے۔ رصدگاہ لِک سے اعلان کیا کہ مریخ کی سطح سے زمین کی طرف کچھ روشنی کے خطوط آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ کہ سیارہ مریخ آباد ہے۔ اور اس کے باشندے بذریعہ ان نورانی خطوط کے زمین کے باشندوں سے گفتگو کرنی چاہتے ہیں:

اس قیاس کے شایع ہوتے ہی علما "مریخیوں" سے نامہ و پیام کرنے کے ذرایع بہم پہنچانے کے درپے ہو گئے۔ اور اگرچہ ابتدا میں یہ کام سخت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن برقیات کی ترقی نے اسے اتنا دشوار نہیں رہنے دیا چنانچہ سائنس دانوں نے اب اس مسئلے پر بحث کرنی ہی چھوڑ دی ہے کہ "ہم مریخ سے باتیں کر سکتے ہیں یا نہیں؟" بلکہ وہ اُن سوالات پر غور کر رہے ہیں جنھیں میں نے اپنے اس مضمون کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے:

اُس برقی تلاطم کا جو مریخ کی ہوا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے۔ امریکا

کے کامیاب عالم برقیات نکولا ٹسلا الملقب بہ "معجزہ نمائے امریکہ" نے بھی بہ سول مطالعہ کیا ہے۔ ابتدا میں تو وہ محض ایک موسمی اثر قرار دیا گیا تھا "لیکن اب" خود ٹسلا کہتا ہے "کہ کامل غور و مشاہدہ کے بعد میں بھی اس یقینی نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ یہ تلاطم خود باشندگان مریخ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس سے ان کی غرض یہ ہے کہ ہم ساکنان ارض اسے سمجھیں اور اس کا جواب دیں" اس بنا پر ٹسلا سنہ ۱۹۰۹ء سے باشندگان مریخ سے گفتگو کرنے کی کوشش شروع کرنے والا ہے اُسے اپنی کامیابی پہ پورا بھروسا ہے۔ ہر ۱۵ سال کے بعد مریخ زمین اور آفتاب دونوں سے قریب ترین موقع پہ آتا ہے اس طرح گویا اخر اگست سنہ ۱۹۰۹ء میں مریخ کا فاصلہ زمین سے صرف ۳۵۰۰۰۰۰۰ میل ہوگا۔ حالانکہ بالاوسط زمین اور مریخ کے مابین ۶۱۰۰۰۰۰۰ میل کا بعد رہتا ہے پس اس قرب سے فائدہ اُٹھانے کے لئے پروفیسر ٹسلا آخر اگست سنہ ۱۹۰۹ء میں زمین کی طرف سے مریخ کو پہلا پیغام بھیجے گا۔ لہذا پہلے زیر عنوان سوال کا تصفیہ ہو گیا۔ اور اس کا جواب یہ ہے۔ کہ آئندہ سال سنہ ۱۹۰۹ء میں مریخ کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہو جائے گا؛

زبان کا مرحلہ درحقیقت سخت پیچیدہ ہے۔ مگر علمائے سائنس ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ باشندگان مریخ فہم و فراست میں ہم سے بہت آگے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ انھوں نے اپنے پیغام ہم تک پہنچانے شروع کردئیے ہیں۔ جن کا جواب دینا تو درکنار ہم اب تک انھیں کماحقہ سمجھ بھی نہیں سکے۔ پس وہ اپنے اعلیٰ ترعلم کے ذریعے سے ہمارے پیغام کو فوراً سمجھ لیں گے اور ہمارے ضعیف سے ضعیف اشارات کا مطلب نکال لیں گے۔ بلکہ اپنے ساتھ باتیں کرنا ہمیں خود سکھا لیں گے؛

ایک عربی مثل ہے "الحدیث ذوشجون" یعنی بات میں سے بات پیدا ہوتی ہے۔ جب مریخ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ تو پھر ہم کلامی کے لئے بہت سے موضوع نکل آئینگے۔ لیکن اس وقت ایک سوال یہ بھی درپیش ہے کہ "ہمارے پہلے پیغام کا مضمون کیا ہوگا؟" اس کا فیصلہ ٹسلا نے

یہ کیا ہے کہ "سب سے پہلا پیغام جو میں بے تار خبر رسانی کے ذریعہ سے بھیجوں گا یہ ہوگا "ہم آپ سے یہ دریافت کرنے کی کہ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ تقریباً دس ہزار سال سے کوشش کر رہے ہیں"۔"

جب سے مریخ کے ساتھ گفتگو کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اس وقت سے تیسرے اور آخری سوال کے حل کرنے کے لئے کہ "گفتگو کیسے ہوگی؟" بہت سی تجاویز پیش کی جا چکی ہیں۔ اور ان پر وقتاً فوقتاً گرم مباحثے ہو چکے ہیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ ایک عریض و طویل جھنڈا بلند کر کے اپنے دوست مریخ کے باشندوں کا خیر مقدم کیا جائے۔ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ آئرلینڈ کے رقبے کی برابر (۳۲۵۰۶) مربع میل کی جسامت کا ایک جھنڈا اس مقصد کو اچھی طرح پورا کر سکے گا۔ ایک دوسری تجویز یہ بھی تھی کہ ہم سطح زمین پر بڑی بڑی نہریں کھودیں جب باشندگان مریخ ہماری زمین کی شکل میں ایسی نمایاں تبدیلی دیکھیں گے تو ضرور اس کی کنہ تک پہنچ جائیں گے۔ اور اس کے جواب میں وہ شاید کوئی فلک فرسا پہاڑ بنائیں گے۔ جس کے مقابلہ میں کم از کم ہمارا کوہ الپس جس کا ارتفاع (۵۷، ۱۴) فٹ ہے۔ بالکل ہی بے حقیقت ہوگا لیکن فنانی امر یکہ ٹسلا ان تجاویز میں سے کسی سے بھی متفق نہیں ہے۔ بلکہ وہ مشہور میکسیم توپ کے موجد سر ہیرام میکسیم کے خیال پر کاربند ہو کر آبشار نائگرا سے برقی قوت حاصل کرنا اور اس کی مدد سے باشندگان مریخ کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ قایم کرنا چاہتا ہے۔ پروفیسر ٹسلا لکھتا ہے۔ کہ آبشار نائگرا سے برقی قوت حاصل کرنے کی جتنی کمپنیاں ہیں۔ اُن سب نے مجھے نائگرا کی برقی طاقت کے ذریعہ سے مریخ تک پیغام پہنچانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ٹسلا نے ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا ہے جس سے بذریعہ مارکونی گراف (بے تار برقی خبر رسانی) چار کروڑ سے دس کروڑ میل تک پیغام بھیجا جا سکتا ہے۔ آبشار نائگرا سے اگرچہ ایک ارب گھوڑوں کی طاقت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر جو خلیج مریخ اور زمین کے درمیان حائل ہے۔ اُس کے پار بے تار برقی پیغام بھیجنے کے لئے اتنی قوت کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ ٹسلا کے بے تار برقی آلات بمقام وارڈنکلف

(لانگ آئیلینڈ) قایم ہو چکے ہیں جن سے ۸......... گھوڑوں کی طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ٹسلا کے مقاصد کے لیے اتنی قوت بھی بہت زیادہ ہے۔ ٹسلا نے بتایا ہے۔ کہ اس ذریعہ سے مریخ کے ساتھ آسانی سے گفتگو ہو سکے گی۔ اور اگر مریخ والے بھی یہی طریقہ استعمال کریں گے۔ تو انہیں ہم تک پیغام پہنچانے کے لئے نسبتاً بہت کم قوت درکار ہو گی۔ کیونکہ جو قوت زمین سے مریخ تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کا صرف سولھواں حصہ مریخ سے زمین تک سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ غرض یہ ترکیب مریخ کے ساتھ گفتگو کی نکالی گئی ہے۔

فی الحال علمائے طبیعیات یہ کوشش کر رہے ہیں۔ کہ کوئی ایسی چیز دریافت ہو جائے کہ اگر اس چیز کو کسی دوسری چیز پر لگا دیں۔ تو اس دوسری چیز پر سے زمین کی کشش کا اثر باطل ہو جائے۔ وہ اس کا امکان اس طرح ثابت کرتے ہیں۔ کہ ایسی چیزیں معلوم ہو گئی ہیں۔ جن پر بجلی گرمی اور روشنی کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ پس بالکل ممکن ہے کہ کسی آئندہ زمانہ میں ایسی چیز بھی دریافت ہو جائے۔ جس پر کشش کا اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ آخر بجلی گرمی روشنی اور کشش درحقیقت ایک ہی قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اور جب ایک قوت کی تین شکلیں اپنا اثر باطل کر سکتی ہیں۔ تو چوتھی شکل کا اثر زائل کیا جا سکنا کون سے تعجب کی بات ہے۔

اس تمام جدوجہد کے نتائج پر اس وقت بمشکل کوئی قیاس قایم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قدر یقینی ہے۔ کہ ان لوگوں کی نسبت جن کی ترقی ہماری دنیا کے کوئی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی۔ یکایک علم حاصل ہو جانے سے ہمارے سائنس دانوں اور فلاسفروں کے آدھے نظریے غالباً اُلٹ جائیں گے اور ہماری زندگی اور شاید ہمارے عقاید کا رنگ بالکل بدل جائے گا۔ بہرحال

"دیدہ باید کہ چہ از پردہ بروں می آید"

(مخزن، مارچ ۱۹۰۸ء)

۶۶

ایک نیا چاند

نظام شمسی کے آٹھ بڑے سیارے آفتاب سے اپنے قرب و بعد کے لحاظ سے دو اقسام پر منقسم ہیں (۱) اندرونی اور (۲) بیرونی ؛

اندرونی وہ ہیں۔ جو آفتاب سے قریب تر ہیں اور بیرونی وہ ہیں۔ جو بہ لنسبت اندرونی سیاروں کے زیادہ فاصلے پر ہیں ؛

عطارد۔ زہرہ۔ زمین اور مریخ یہ چار اندرونی ہیں۔ مشتری۔ زحل اور دونوں نو دریافت سیارے یورینس ونیپچون بیرونی ہیں ؛

ان دو نو طبقوں کے سیاروں میں جہاں اور کئی جدا جدا خصوصیات ہیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ ہر ایک سیارے کے چاندوں کی تعداد مختلف ہے۔ مثلاً پہلی قسم کے چار سیاروں کے درمیان صرف تین چاند بتائے جاتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے چار سیاروں کے درمیان سترہ یا اٹھارہ ؛

عطارد اور زہرہ کا کوئی چاند نہیں ہے۔ اور چونکہ دونوں آفتاب سے بہت قریب ہیں اور حجم بھی ان کا بہت چھوٹا ہے۔ اس لئے شاید ان کو کسی چاند کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ چھوٹے حجم کی مدور چیز کے ایک حصے پر جب تیز روشنی پڑتی ہے۔ تو تھوڑی بہت چمک دوسرے حصے تک ضرور پہنچتی ہے ؛

زہرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی سطح میں آفتاب کی روشنی کو منعکس کرنے کی قوت اس قدر ہے کہ ایسی کسی اور سیارہ میں نہیں ہے۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ آفتاب کی روشنی کا عکس کچھ نہ کچھ زہرہ کی نصف تاریک سطح پر ضرور پڑتا رہتا ہوگا۔ اور اس طرح زہرہ چاند کی ضرورت سے مستغنی ہوگیا ہوگا ؛

سنہ ۱۶۴۵ء اور سنہ ۱۷۶۸ء کے درمیان چھ سات ہیئت دانوں نے دعوے کیا تھا۔ کہ زہرہ کا بھی ایک چاند ہے۔ مگر بعد کے مشاہدوں نے اس دعوے کو بالکل باطل ثابت کر دیا ہے۔ بلجیم کے مشہور فلک داں اسٹروبینٹ نے یہ نتیجہ نکالا ہے

کہ جس چیز پر زہرہ کے چاند کا دھوکا ہوا ہے۔ وہ کوئی اور ستارہ یا شاید چھوٹا سا سیارہ ہوگا اور کچھ تعجب نہیں کہ وہ سیارہ یولیتس ہو۔

اب ترتیب کے لحاظ سے مجھے زمین کے چاند کا ذکر کرنا چاہئے۔ اور دراصل اسی کے متعلق مجھے کچھ کہنا ہے۔ لیکن میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اسے سب سے آخر میں بیان کروں۔

مریخ کے دو چاند فوبوس اور ڈیموس ہیں۔ جنہیں واشنگٹن (امریکا) کے پروفیسر ہال نے اگست ۱۸۷۷ء رصد کیا تھا۔ ان دونوں کی جسامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے قطر ہمارے چاند کے قطر ۲۱۶۰ میل کے مقابلے میں علی الترتیب ۷ اور ۶ میل ہیں۔

مشتری کے پانچ چاند ہیں۔ جن میں سے تین کے نام یوروپا گینمیڈ اور کیلیسٹو ہیں۔ مشتری کے چار چاندوں کو تو گیلیلیو نے جنوری سنہ ۱۶۱۰ء میں ہی دیکھ لیا تھا۔ مگر پانچواں چاند اتنا چھوٹا ہے۔ کہ وہ اس کی کمزور دوربین کی رصد میں نہ آسکا اور اُسے ۹ ستمبر ۱۸۹۲ء کو پروفیسر برنارڈ نے رصدگاہ لک (کیلیفورنیا) کی طاقت ور دوربین کے ذریعے سے معلوم کیا۔ پہلے چار چاندوں کو بعض لوگوں نے خالی آنکھ سے بھی دیکھ لیا ہے۔ مشتری کے چاندوں میں بڑا گینمیڈ ہے۔ جس کا قطر ۳۹۸۰ میل ہے۔ گویا یہ ہمارے چاند سے بڑا ہے۔

نظام شمسی میں سب سے زیادہ تعداد چاندوں کی سیارہ زحل کے پاس ہے یعنی آٹھ جو سنہ ۱۶۵۵ء اور سنہ ۱۸۴۸ء کے مابین دریافت ہوئے ہیں۔ ان کے نام علی ترتیب قرب یہ ہیں۔ میماس۔ انسیلاڈس۔ ٹیتھس۔ ڈایونی۔ رہی ٹیٹن۔ ہائپرین۔ آئی پیٹس۔ ان میں سے دو کا حجم ہنوز تحقیق نہیں ہوا۔ باقی میں سب سے بڑا ٹیٹن ہے۔ جس کا قطر ۳۲۰۰ میل ہے۔

جتنی روشنی ہم باشندگان ارض سورج سے حاصل کرتے ہیں زحل کو اس کا صرف سواں حصہ ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے۔ کہ نجومیوں نے زحل کو نحس شمار کیا ہے۔ اور اخلاقیوں نے نصیحت کی ہے۔ کہ بلندی و نحسی مکن چوں زحل۔

اگرچہ یہ کمی اس کے آٹھ چاندوں کی وجہ سے بہت کچھ پوری ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زحل اپنے کثیر التعداد چاندوں سے پورے طور پر متمتع ہوتا ہے۔ کیونکہ باوجودیکہ یہ آٹھوں چاند مل کر ہمارے چاند سے چھ گنے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی روشنی ہمارے چاند کی روشنی کا صرف سولھواں حصہ ہے ؛

یورینس کے متعلق ایک زمانہ میں خیال تھا۔ کہ اس کے بھی آٹھ چاند ہیں۔ جن میں سے چھ کے نام معلوم کرنے کا سہرا سر ولیم ہرشل کے سر رکھا جاتا تھا۔ مگر اب جمہور علمائے فلکیات اس امر پر متفق ہو گئے ہیں۔ کہ یورینس کے صرف چار چاند ہیں۔ ایریل۔ امبریل۔ ٹٹانیا اور اوبیون۔ آخر الذکر دو چاند انھی چھ چاندوں میں سے ہیں۔ جن کو سر ولیم ہرشل نے معلوم کیا تھا۔ یہ چاند جنوری سنہ ۱۷۸۷ء اور اکتوبر سنہ ۱۸۴۷ء کے درمیان دریافت ہوئے تھے۔ اور وہ اس قدر چھوٹے ہیں۔ کہ صرف خاص خاص دوربینوں سے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق انسانی علم کا دائرہ بہت محدود ہے۔ سر ولیم ہرشل کے نظریئے میں غلطی ہونے کی یہ وجہ تھی کہ اس نے بعض موقعوں پر چند دوسرے چھوٹے چھوٹے ستاروں کو چاند سمجھ لیا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ان چھ مفروضہ چاندوں میں سے صرف دو درحقیقت یورینس کے چاند ہیں ؛

قابل وثوق تحقیقات کے مطابق نیپچون کا صرف ایک چاند ہے۔ مگر یہ بھی غیر اغلب نہیں ہے کہ اس کے دو چاند ہوں۔ اور چونکہ ابھی خود نیپچون کے متعلق کافی حالات معلوم نہیں ہوئے۔ اس لئے اس کے چاند کے باب میں بھی سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ کہ اس کا قطر (۲۰۰۰) میل سے بھی کم ہے۔ اور ۱۰۔ اکتوبر سنہ ۱۸۴۶ء کو پروفیسر لیسل نے اسے دیکھا تھا۔ نیپچون سے اس کا فاصلہ (۲۲۳۰۰۰) میل ہے۔ پانچ دن ۲۱ گھنٹے اور ۵ منٹ میں وہ نیپچون کے گرد گھوم جاتا ہے ؛

نیپچون سے اُس طرف کسی اور سیارہ کا ہونا اگرچہ خلاف قیاس نہیں ہے۔ لیکن ابھی تک ایسے سیارے کا علم نہیں ہوا ؛

اب میں زمین کے چاند کے متعلق کچھ لکھتا ہوں۔ زمین کے اس چاند

کی نسبت جس کو انسان نسلاً بعد نسل دیکھتا چلا آیا ہے۔ کچھ کہنا میرے اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔ بلکہ میں زمین کے "نئے چاند" کا حال چند سطروں میں عرض کروں گا۔

اس چاند کا مطالعہ اٹاوا (امریکا) کا پروفیسر ای۔ اسٹون وگنر ۱۸۸۲ء سے کر رہا ہے۔ ۱۰ مئی ۱۸۸۲ء کو سورج گرہن پڑا تھا۔ لیکن اس وقت نہ ابر تھا اور نہ "پرانا چاند" ایسے موقع پر تھا جہاں سے اس کا سایہ سورج پر پڑسکے اس کا سبب پروفیسر وگنر کے نزدیک یہی تھا کہ زمین اور آفتاب کے درمیان "نیا چاند" حائل ہوگیا تھا۔ جب پروفیسر وگنر نے اپنے اس خیال کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تو اس کا مضحکہ کیا گیا مگر ایک انجینیر میجر اے۔ بی۔ راجرز نے جو کینیڈین پیسفک ریلوے کی پیمائش کر رہا تھا اپنی ایک چٹھی میں اس کی تصدیق کی پروفیسر گینز کا خیال ہے۔ کہ اس چاند میں اس قدر کاربن ہے۔ کہ سورج کی روشنی بہت کم اس پر اپنا اثر کرتی ہے۔ نیوزی لینڈ اور شمالی امریکہ کے باشندوں نے اسے بارہا ۲۰۔ ۲۰ منٹ تک سبز ہلالی شکل میں دیکھا ہے پروفیسر وگنر نے یہ بھی غور سے دیکھا ہے۔ کہ جب دونوں چاند ایک ہی سمت میں زمین کے قریب آجاتے ہیں۔ تو ان کی متحدہ کشش کی وجہ سے زمین کے اس حصے پر سردی بڑھ جاتی ہے۔

نئے چاند کے متعلق مزید تحقیقات ہو جانے کے بعد اس کا نام ضرور متعین کیا جائے گا جو غالباً "وگنر" ہوگا۔

کیا تعجب ہے کہ کچھ عرصہ میں کاربن کم ہو جائے۔ اور وہ پوری روشنی دینے لگے اس صورت میں اگر دونوں چاند ساتھ ساتھ چمکے تو زندگی کے بہت سے دھندے جو اب غروب آفتاب کے ساتھ تہ کر دینے پڑتے ہیں۔ رات میں ہوتے رہا کریں گے اور اگر نئے اور پرانے چاند باری باری سے روشنی دینگے۔ تو بھی ایک نیا سماں ہوگا۔ اور ہماری یہ ضرب المثل کہ "چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات"، بالکل مہمل ہو جائے گی۔ واللّٰہ اعلم و علمہ احکم!!!

اسی ضمن میں ایک نئے سورج کی نسبت بھی مختصراً سن لیجیے۔ یوں تو بہت سے ایسے ستارے ہیں جن کی نسبت شبہ ہے کہ یہ بذات خود آفتاب

ہیں۔ اور ان کا کوئی مستقل نظام مثل ہمارے نظام شمسی کے ہے۔ جس کا مرکز ہمارا یہ آفتاب ہے لیکن یکم مئی ۱۹۰۹ء کو رصدگاہ حیدرآباد دکن کے مہتمم مسٹر چیٹ وڈ نے ایک نیا ستارہ دریافت کیا ہے جس کا فاصلہ بہ نسبت اس فاصلے کے جو زمین سے آفتاب تک ہے ہزار گنا ہے اسکی شعاع کو زمین تک پہنچنے میں پانچ لاکھ سال کا عرصہ درکار ہے خیال کیا گیا ہے کہ پانچ ہزار سال کے بعد آفتاب مع اپنے توابع کے اس ستارہ سے ٹکرائے گا۔ مسٹر چیٹ وڈ نے اس ستارے کا نام اپنے محسن مسٹر واکر کے نام پر "واکر اسٹار" رکھا ہے۔ اور اس کی نسبت یقین ہے کہ ضرور کوئی آفتاب ہے۔ اس طرح گویا یہ ایک نیا آفتاب دریافت ہوا ہے ؎

۶۷

آئین اور اسلام

(مجلۃ المجلات سے ترجمہ)

آج کل مغربی قومیں اپنے اس آئین پر فخر کرتی ہیں۔ جو ان کی ترقی کی بنیاد اور فرماں رواؤں اور حکومتوں کے مقابلہ میں ان کی آزادی کی دلیل ہے۔ یہ آزادی وہ ہے۔ جس سے سلاطین اور حکام کے ہاتھ پبلک کے کاموں میں دخل دینے سے بندھ گئے ہیں۔ اور جس نے اس طبقہ کو اپنی قوم اور اپنی رعایا کے ارادوں کے طوق وسلاسل میں ایسا جکڑ دیا ہے۔ کہ اس سے وہ کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ؛

مگر انھی مغربی قوموں پر ایک زمانہ ایسا بھی گزر گیا ہے۔ جب انھیں ان میں سے کوئی بات حاصل نہ تھی ؛

ان قوموں کے لئے بالکل جایز ہے کہ اپنے آئین پر۔ اپنی آزادی پر فخر ومباہات کریں لیکن یہ حق انھیں کسی طرح حاصل نہیں ہے۔ کہ ان تمام باتوں کو اپنی ایجاد بتائیں۔ اور مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا یہ سبب قرار دیں کہ (مغربیوں کے گمان کے مطابق) مسلمانوں کے مذہب نے طلب حقوق سے

اُن کے مُنہ بند کر دیئے ہیں۔ اور انہیں حکم دیا ہے کہ اپنے بادشاہوں اور حکمرانوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہو۔ اور جو کچھ وہ چاہیں۔ انہیں کرنے دو ؞

یورپ کے بعض مدبر اپنی حکومتوں سے کہہ رہے ہیں۔ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمان ترقی کریں اور تہذیب و شائستگی میں تمہارے دوش بدوش چلیں تو اس قرآن کو (اعوذ باللہ) ان کے سینوں سے محو کر دو۔ اور ان کے منہ مسجد حرام سے پھیر دو۔ کیونکہ جب تک مسلمان اپنے مذہب پر قایم رہیں گے۔ ان کی یہی حالت رہے گی۔ اور انہیں صلاح و فلاح نصیب نہیں ہو گی ؞

لیکن اِن قوموں اور اسلام کے درمیان تاریخ شاہد ہے (و التاریخ اعدل الشواہد) کہ آئینی حکومت کی بُنیادوں میں پہلا پتھر اسلام ہی نے رکھا۔ پھر اس پر اضافہ کیا یہاں تک کہ اس کی بنیاد بلند ہو گئی۔ اسلام ہی نے حقیقی آزادی کا بیج مسلمانوں کے سینوں میں بویا۔ یہاں تک کہ وہ پھلا پھولا اور شیریں پھل لایا اور جس زمانہ میں اسلام آئینی حکومت کے سایہ میں پرورش پا رہا تھا۔ اور آزادی کے لذیذ و خوش ذایقہ ثمر سے شیریں کام ہو رہا تھا۔ مغربی قومیں اپنے بادشاہوں اپنے حکام اپنے پوپوں اور دوسرے پیشوایان مذہب کی غلام بنی ہوئی اور اُن کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھیں ؞

جس وقت اسلام دنیا میں آیا ہے۔ زبردست زیردست کو ملتے دلتے رہتے تھے۔ جبر و تعدی کا سودا دماغوں میں سمایا ہوا تھا۔ یا بعبارت دیگر جیسا کہ آج کل کے مدبرین کا قول ہے کہ "الحق للقوۃ" جس کی لاٹھی تھی اُس کی بھنیس بھی تھی۔ لیکن اسلام نے اس کا نقش مٹایا اور دلوں کو اُن آلودگیوں سے پاک کر کے ایک قانون مرتب کیا۔ جسے ہاتھ میں لے کر مسلمان اقوام عالم کی پہلی صف میں آ گئے۔ اور ایسی قوت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج پہنا۔ ملک فتح کئے قلعے توڑے لشکروں کو شکستیں دیں۔ اور سلاطین ذی جبروت کے پایہ تختوں کی بنیادوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ یہ سب اسی ایک قانون کا طفیل تھا۔ جسے قرآن لایا اور سنت نبویہ نے جس کی تائید کی ؞

اور وہ آزادی کیا ہے۔ جس پر مغربی قومیں اس قدر فخر کرتی اور اس

کی تقلید کی ہمیں ترغیب دیتی ہیں؟ کیا اُن کا اپنے بادشاہوں کے ساتھ وہی برتاؤ ہے جو ہمارا خلفائے راشدین اور سلاطین متقدمین کے ساتھ تھا؟ کیا اس وقت بھی یورپ کی آزادی اپنے اپنے شہنشاہوں کے مقابلہ میں اس حد تک پہنچی ہوئی ہے جس حد تک عرب کی آزادی تاریخ خلفاء کے مقابلہ میں پہنچی تھی؟ یورپ میں قوانین کا اثر بادشاہوں تک ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ بادشاہ قوانین کی حد سے اعلیٰ و ارفع سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کی تلوار عرب کی ترقی و عظمت کے زمانے میں عوام مسلمین اور خلفاء کے لئے یکساں کھنچی ہوئی تھی۔ پس کون سا قانون ان دونوں میں افضل ہوا۔ یورپ میں لوگ حسب اختلاف مدارج بر سر حکومت طبقہ کو تعریفی الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اور سوائے خواص کے اور کوئی ان کے حضور میں باریاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسلام کے صدر اوّل میں عوام خلفاء و امراء کو برابر والوں کی طرح مخاطب کرتے اور سلاطین کے دروازے ہر چھوٹے بڑے کے لئے یکساں کھلے رہتے تھے۔ اب فرمائیے۔ کہ ان دونوں میں کون سی آزادی بڑھی ہوئی ہے؟

اگر اقوام یورپ اپنی اُن پارلیمنٹوں پر فخر کرتی ہیں۔ جن کے اجلاس صرف اوقات معینہ پر ہوتے ہیں۔ تو وہ سُن لیں۔ کہ مسلمانوں کی پارلیمنٹ ہر وقت منعقد رہتی تھی۔ اور اس میں قومی معاملات پر ہر وقت بحث ہوا کرتی تھی۔ خلفاء نے اذن عام دے رکھا تھا۔ کہ قوم کا ہر فرد ہماری معاونت و مساعدت کرے اور اگر ہم حق کے خلاف کریں۔ اور قرآن کی حد سے باہر نکلیں تو ہرگز ہماری متابعت نہ کرے۔ اور نہ اُنہیں یہ طمع تھی۔ کہ ہمارے بعد ہماری اولاد ملک کی وارث ہو۔ بلکہ خلیفہ وہی ہوتا تھا جس کو کثرت رائے کے ساتھ مسلمان خلیفہ بنا دیتے تھے۔ لیکن یورپ میں ملکی نظام بالکل اس کے خلاف ہے۔ اور آج کے بادشاہ کا بیٹا کل کو خود بادشاہ ہوتا ہے۔ پس کس قدر فرق ہے۔ یورپ کی مایہ الافتخار تہذیب اور اس شائستگی میں جو دست بُرد زمانہ سے فنا ہو گئی۔

جو لوگ اسلام میں آئین و آزادی کی روح کے منکر ہیں۔ ان کے سامنے ہم چند آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ اور ایک دو تاریخی واقعات پیش کرتے

کرتے ہیں۔ تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ اسلام کس قسم کی شائستگی اور مدنیت کو اپنے ساتھ لایا۔ باوجودیکہ خدائے تعالے نے اپنے نبی صلعم کو لوگوں کے ساتھ مشاورت سے مستغنی کردیا تھا۔ لیکن پھر بھی بمقتضائے بشریت ان کو حکم دیا کہ

شاورھم فی الامر | معاملات میں لوگوں سے مشورہ کرو۔

جو لوگ آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی شان میں فرمایا ہے:۔

الذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم و مما رزقنٰھم ینفقون | جو لوگ اپنے پروردگار کا حکم مانتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور اپنے معاملات میں باہم مشورہ کرتے ہیں اور خدا کے دئیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں (اللہ کے نزدیک ان سے اچھا کوئی نہیں)

رسول اللہ صلعم نے بہت سے موقعوں پر اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ:۔

اشیروا علیّ | مجھ سے مشورہ لیا کرو۔

آپ سے حزم کے متعلق سوال کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا:۔

ان تسترشد | یہ کہ راہ راست ڈھونڈو۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا ہے:۔

ماخاب من استخار و لا ندم من استشار | طالب خیر ٹوٹے میں نہیں رہیگا اور نہ مشورہ لینے والا کبھی ندامت اٹھائے گا

پھر فرمایا ہے کہ

ما شقی عبد بمشورۃ ولا سعد من استغنیٰ برایہ | جو بندہ مشورہ کرے گا بدبختی میں مبتلا نہ ہوگا لیکن جو اپنی ہی رائے پر بھروسا کرے گا وہ کبھی سعادت حاصل نہ کرے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضہ فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلعم سے زیادہ کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا۔ آپ اپنے اصحابؓ سے اکثر واقعات اور معاملات کے متعلق رائے لیا کرتے تھے"۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "مشورہ میں سات خوبیاں ہیں ٹھیک بات

معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرے کی رائے کا پتہ لگ جاتا ہے۔ لغزش نہیں ہونے پاتی۔ ملامت سے آدمی بچ جاتا ہے۔ شرمندگی نہیں اٹھانی پڑتی۔ دلوں میں محبت بڑھتی ہے۔ اور دوسروں کی عمدہ تقلید کا موقع ملتا ہے"۔ یہ مشورہ کے متعلق اسلام کی ہدایتوں کا تھوڑا سا نمونہ ہے۔ لیکن یہی اس آئین کی بنیاد ہے جس پر یورپ کی تہذیب قائم ہے تو کیا اس پر بھی کہا جائے گا۔ کہ اسلام نے اپنے پیرووں کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں؟

اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں۔ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آئین مسلمانوں کے ہر رگ و پے میں رچا ہوا تھا اور حکومت کے مقابلہ میں عوام الناس کی آزادی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ مغربی قوموں کی آزادی ابھی وہاں تک نہیں پہنچی۔ کیا یورپ کے کسی ملک میں ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ کسی بادشاہ کے گرد لوگ جمع ہوں۔ اور ایک شخص اس کارروائی کو ناجائز سمجھ کر ان پر تلوار لے کر دوڑے اور تلوار چھین جانے پر بھی کوئی اس سے تعرض نہ کرے؟ یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔ ایسے شخص کو نہ صرف طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ بلکہ کتے کی موت مارا جائے گا لیکن مسلمانوں کے زمانہ میں ایسا بارہا ہو چکا ہے۔ چنانچہ جس وقت حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول کے ہاتھ پر لوگ بیعت کر رہے تھے۔ ایک شخص خباب ابن منذر نامی آیا۔ اور تلوار کھینچ کر ان لوگوں پر دوڑ پڑا۔ جب تلوار چھین لی گئی۔ تو اس نے ایک کپڑا لے کر دیوانہ وار اس سے لوگوں کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ لوگ بیعت سے فارغ ہو گئے۔ اب وہ اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اے گروہ انصار! تم نے بیعت کی تو ہے لیکن خدا کی قسم مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہاری اولاد ان خلفاء کی اولاد کے دروازہ پر جا کر کھڑی ہوا کرے گی۔ اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگا کرے گی۔ اور یہ پانی تک نہیں پلایا کریں گے"۔ خباب نے یہ کچھ کیا۔ لیکن اس کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ اور جس شخص کی ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی تھی۔ اس نے سوائے اس کے کچھ نہیں کہا کہ "خباب! کیا ہم سے ڈرتے ہو؟" خباب نے جواب دیا کہ "تم سے تو نہیں ڈرتا۔ مگر تمہارے بعد آنے والوں سے ڈرتا ہوں"۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ "اگر یہ بات ہے۔ تو اختیار تمہیں اور

تمہارے ساتھیوں ہی کو ہوگا۔ تم ہمارے پابند تھوڑا ہی ہو"!

اگر آپ تاریخ اسلام کی جانب رجوع کریں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے متعلق جس قدر رد و کد ہوئی تھی اور پھر خلیفہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو تقریر کی تھی اس کے ایک ایک لفظ میں وہ آئین۔ اور ایک ایک حرف میں وہ آزادی ہے کہ اس کا مثل نہ اس زمانے میں پایا جاتا ہے۔ نہ آئندہ اس کی امید ہے۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے:۔

"اے لوگو۔ خدائے جلیل نے جو کریم۔ حکیم۔ علیم۔ رحیم۔ حلیم ہے۔ محمد (صلعم) کو ایک امر حق دے کر بھیجا۔ تم گروہ عرب۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ تم میں باہم نفاق پھیلا ہوا تھا۔ اسی نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی۔ تمہاری مدد کی۔ تمہارے دین کو مضبوط کردیا اور اپنے نبی کی سیرت راشدہ تم کو ورثہ میں دی جس سے تم ہدایت پاسکتے ہو۔ پس تم کو چاہئے کہ اس نیک ہدایت پر عمل کرو۔ اور بندگی کو لازم جانو۔ خدا ہی نے تم پر ایک خلیفہ مقرر کیا ہے۔ تاکہ اُس کے ذریعہ سے تم میں الفت قایم رہے۔ اور تمہارا بول بالا ہو۔ پس اس میں تم میری اچھی طرح مدد کرو۔ خدا نے چاہا۔ تو اس شخص پر میں اپنا ہاتھ یا اپنی زبان ہرگز دراز نہ کروں گا جو اس کا مستحق نہ ہوگا۔ خدا کی قسم اندھیرے اُجالے خلافت کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی۔ اور نہ ظاہر و باطن خدا سے اس کے لئے دعا مانگی۔ میرے سر پر یہ ایک بار عظیم ہے۔ جس کے اُٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے لئے مجھ سے زیادہ قابل لوگ موجود ہیں۔ پس جب تک میں خدا کی اطاعت کروں۔ تم میری اطاعت کرو۔ اور اگر میں اُس کے حکم سے سرتابی کروں۔ تو تم بھی میرا حکم نہ مانو"!

اتنا کہہ کر آپ رو دئے۔ پھر فرمایا:۔

"میں اس عہدے پر اس لئے مقرر نہیں ہوا ہوں۔ کہ تم پر تفوق حاصل کروں۔ بحالیکہ میں جانتا ہوں۔ کہ تم میں سے بعض اس کام کے لئے مجھ سے

زیادہ موزوں ہیں۔ اگر تم مجھ سے یہ امید کرتے ہو۔ کہ جس طرح خدا اپنے رسول مقبول پر وحی نازل کیا کرتا تھا۔ اسی طرح مجھ پر بھی وحی بھیجتا رہے گا۔ تو یقین رکھو کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ بلکہ میں تو ویسا ہی ہوں۔ جیسے تم ہو۔ پس جب تم دیکھو کہ میں سیدھا چل رہا ہوں۔ تو میری متابعت کرو۔ اور اگر دیکھو کہ میں نے غلطی کی تو مجھے ٹھیک کردو"

اگر حضرت ابوبکرؓ کے قول پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمان اضافہ کردیا جائے کہ "جو کوئی عمر میں کجی پائے۔ اُسے چاہئے کہ اس کو ٹھیک کردے (یہ سن کر ایک عرب اپنی تلوار سونت کر کھڑا ہوگیا۔ اور کہنے لگا کہ "اگر ہم تم میں کوئی کجی دیکھیں گے۔ تو اسے اپنی تلوار سے سیدھا کریں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "خدا کا شکر ہے کہ اس اُمّت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ کہ اگر عمر میں کوئی ٹیڑھا پائیں تو اسے اپنی تلوار سے نکالنے کے لئے تیار ہیں") تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلام اپنی ترقی کے زمانہ میں آزادی اور آئین کی نعمت سے بخوبی بہرہ اندوز تھا۔

تاریخ عالم اس امر کی شہادت سے بھری پڑی ہے کہ بلاد متمدنہ میں آج ہم جو عمدہ سیاسی قواعد دیکھتے ہیں۔ وہ دین محمدی کے وضع کئے ہوئے ہیں اور اگر مسلمان ان پر کاربند رہتے۔ تو ان کی قوت زائل نہ ہوتی۔ اور کسی ظالم کا دست تعدی ان پر دراز نہ ہوسکتا۔ لیکن وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور اس سے ان کی جو حالت ہوئی۔ وہ ظاہر ہے۔ مسلمانوں پر اس حال میں صدیاں گزر گئیں۔ کہ نہ وہ اپنے مرض کو پہچانتے ہیں۔ نہ اپنے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ شاید خدا اپنی قدرت اور شان دکھائے۔ اور انہیں قبر سے نکال لے اور ان میں نئی روح پھونک دے۔ جس سے انہیں اپنی کھوئی ہوئی عزت اور شوکت حاصل ہو۔ (روزانہ پیسہ اخبار مورخہ ۱۳ و ۱۴ اگست ۱۹۰۹ء)

۶۸
سفر

سفر عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی راستہ چلنے کے ہیں۔ اگر تم اپنے گھر سے مدرسے جاؤ۔ یا کسی دوست سے ملنے جاؤ۔ یا شام کو ہوا خوری کرنے نکلو۔ تو اسے سفر نہیں کہتے۔ سفر سے مراد ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانا ہے۔

پہلے پہل لوگ پیدل سفر کرتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ ایسے سفروں میں تکلیف زیادہ ہوتی تھی۔ اور راستہ بھی دیر میں کٹتا تھا اس کے بعد جانوروں کو سواری کے لئے سدھایا۔ اور ان پر سفر کرنا شروع کیا۔ کہیں گھوڑے سواری میں آنے لگے۔ کہیں اونٹ۔ کہیں گدھے۔ کہیں خچر۔ جنوبی افریقہ میں بیل پر زین کس کر سوار ہوتے ہیں۔ ریگستانوں میں اونٹ پر سفر کرتے ہیں۔ عرب کے ملک میں لوگ گدھوں پر سوار ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں راجہ مہاراجہ نواب اور بعضے امیر آدمی ہاتھی کو سواری کے کام میں لاتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات سنو! بعض جگہ لوگ شتر مرغ پر بھی سوار ہوتے ہیں۔

شتر مرغ کی گاڑی

ہندوستان میں پہلے پالکی اور سکھ پال کا بہت رواج تھا۔ اب کم ہوتا جاتا ہے۔ پالکی کی صورت کی ایک چیز اور بھی ہوتی تھی۔ جسے تام جھام کہتے تھے۔ اس کی شکل کرسی سے بہت ملتی جلتی تھی۔ پالکی اور سکھ پال میں چاہیں تو لیٹ بھی سکتے ہیں۔ مگر تام جھام میں بیٹھا رہنا پڑتا تھا۔ اس کا چین میں بہت رواج ہے۔ اب سے دو سو سال پہلے لندن میں بھی امیر آدمی اس پر اکثر سوار ہوا کرتے تھے۔ یورپ میں پالکی اٹھانے کے لئے کہاروں کی جگہ گھوڑے لگتے تھے۔ اب اس قسم کی پالکیوں کا رواج صرف منگولیا میں رہ گیا ہے چین اور جاپان میں جن رکشا گاڑیاں اکثر استعمال کی جاتی ہیں۔ انہیں قلی کھینچتے ہیں۔ ہندوستان میں بعض بعض جگہ ان میں میمیں سوار ہوتی ہیں یہ سواریاں جن کا اوپر بیان ہوا ہے
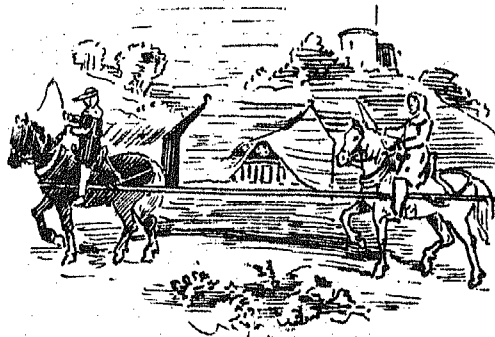
قدیم یورپین طرز کی پالکی

تنگ اور اونچے نیچے راستوں میں بھی چل سکتی ہیں۔ لیکن گاڑیوں کے لئے کشادہ اور ہموار راستوں کی ضرورت ہے۔ پہلے جب سڑکیں کچی ہوتی تھیں تو گاڑیاں ایک گھنٹے میں صرف تین چار میل چل سکتی تھیں۔ اس زمانہ میں لوگ بہلیوں اور رتھوں میں سوار ہوتے تھے۔ لیکن جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی۔ اور پکی سڑکیں بن گئیں۔ تو سفر میں آسانی ہوگئی اور بگھیاں دوڑنے لگیں۔

آج کل دنیا کے تمام شہروں میں بائیسکلیں اور موٹر گاڑیاں کثرت سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ ایسی تیز ہوتی ہیں۔ کہ گھوڑا ان کے برابر نہیں چل سکتا ٹمٹموں کا بھی بہت رواج ہو چلا ہے۔ بمبئی اور کلکتہ میں تو ہر بازار اور کوچے میں ٹمٹمیں نظر آتی ہیں۔

جس زمانے میں پکی سڑکیں نہ تھیں۔ تو مسافروں کو ہر وقت

ڈاکوؤں کا ڈر رہتا تھا۔ اور لوگ قافلے بنا بنا کر چلتے تھے۔ ایک ایک قافلے میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو آدمی ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان میں اب قافلے چلنے موقوف ہو گئے ہیں۔ لیکن جن ملکوں میں سڑکیں نہیں ہیں۔ وہاں اب بھی یہی دستور ہے۔ ۱۸۲۱ء میں ریل ایجاد ہوئی۔ اور اس کے جاری ہوتے ہی سفر کی صعوبتیں جاتی رہیں۔ اب تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کہ ہم گھر میں بیٹھے ہیں یا سفر کر رہے ہیں۔ حالی ؎

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں

ہندوستان میں پہلے پہل ۱۸۵۳ء میں ریل جاری ہوئی۔ اور بمبئی سے تھانے تک ۲۱ میل کا ٹکڑا تیار ہوا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کی توسیع ہو گئی یہاں تک کہ اب تمام ملک میں اس کا جال سا پھیل گیا ہے؛

بعض ملکوں میں زمین پر اکثر برف جمی رہتی ہے۔ ان ملکوں کے لوگ ایک قسم کی گاڑیاں استعمال کرتے ہیں جنہیں سلیج کہتے ہیں۔ ان میں پہئے نہیں ہوتے۔ شمالی امریکہ میں انہیں ہرن یا کتے کھینچتے ہیں۔ اور بہت تیزی سے لے جاتے ہیں؛

یہ سب تو خشکی پر سفر کرنے کے ذریعے ہیں۔ دریاؤں جھیلوں و سمندروں میں سفر کرنے کے لئے انسان نے کشتیاں اور جہاز بنائے ہیں۔ کشتی کا خیال غالباً درخت کی کسی ٹہنی کو بہتا ہوا دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا چنانچہ انسان نے اول اول جو چھوٹی اور بھدی کشتیاں بنائی تھیں۔ وہ درخت کے تنے کو خالی کر کے بنائی تھیں۔ ایسی کشتیاں بنگال کے بعض مقاموں پر اب بھی دیکھنے میں آتی ہیں اگلے زمانے میں برطانیہ کے باشندے ایک ٹوکری سی بُن کر اس پر چمڑا چڑھا لیتے تھے۔ اور اس میں تیرتے تھے۔ بعض جگہ ایک بڑی سی مشک لے کر اس میں ہوا بھر لیتے ہیں۔ اور اس پر بیٹھ کر دریا کے پار اتر جاتے ہیں۔ انہیں سرنا کہتے ہیں دریائے سندھ پر اس کا رواج بہت ہے؛

کشتیوں کے بعد بادبانی جہاز ایجاد ہوئے۔ اُن میں بڑی دقت یہ تھی

کہ جب ہوا تیز ہوتی تھی۔ تو ان کا چلنا مشکل ہوتا تھا۔ اور جب زیادہ تیز ہوتی تھی تو ڈوبنے کا ڈر رہتا تھا۔ اس کے بعد دخانی جہاز نکلے۔ ان سے نہایت سہولت پیدا ہوگئی۔ بعض باتوں میں تو ان میں ریل سے بھی زیادہ آرام ملتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ کے درمیان جو جہاز چلتے ہیں۔ ان پر مسافر فٹ بال کرکٹ اور ٹینس بھی کھیلتے جاتے ہیں۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو جہاز چلتے ہیں انہیں اگر کسی محل شاہی سے تشبیہ دیں۔ تو بیجا نہیں۔ سجے سجائے کمرے۔ سنگ مرمر کے نفیس حمام ہر قسم کے آرام و آسایش کے سامان مہیا ہیں۔ رات کو بجلی کی روشنی سے تمام جہاز جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ ان کی چال بھی خاصی ہے بیس پچیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتے ہیں؛

یہ تو خشکی اور تری کے سفر کے وسائل ہیں۔ ان کے علاوہ سفر کا ایک طریق اور بھی ہے؛

کچھ عرصہ سے یورپ والے ہوا میں اڑنے کی کوشش کر رہے ہیں

اُڑنے کی مشین جسکی ساخت مثل پرون کے ہے۔

اس کے لئے انہوں نے غبارے اڑنے کی کلیں اور ہوائی جہاز بنائے ہیں ابھی ان میں پوری کامیابی تو نہیں ہوئی۔ تاہم روز بروز کچھ نہ کچھ ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ زمانہ قریب ہے کہ لوگ ہوا میں پھرتے نظر آیا کریں گے۔

(گلدستہ مضامین داخل کورس پنجاب یونیورسٹی)

۶۹

زندگی کا سہارا

آدمی اَن کا کیڑا ہے۔ اور روٹی اس کی زندگی کا سہارا۔ اناج پیس کر آٹا تیار کرتے ہیں۔ اور آٹے کی روٹی پکاتے ہیں۔ ہر ملک میں جدا جدا شکل کی روٹیاں پکتی ہیں۔ کہیں چھوٹی۔ کہیں بڑی۔ کہیں موٹی۔ کہیں پتلی۔ کہیں گول۔ کہیں چوکھونٹی۔

فرانس اور ایران میں تو دو دو گز لمبی روٹی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بعض جگہ آدھ گز لمبی۔ انگلستان میں ڈبل روٹی اور بسکٹ زیادہ استعمال میں آتے ہیں۔ ہندوستان میں توے کی چپاتی اور تنور کی روٹی کا رواج ہے۔ فرانس میں چھلے اور گھوڑے کی نعل کی شکل کی روٹی پکتی ہے۔ اور ان کا رنگ بالکل کالا ہوتا ہے۔ یورپ میں شادی کی تقریبوں کے لئے جو روٹیاں تیار ہوتی ہیں۔ ان کو "روٹی کا پہاڑ" کہیں تو بے جا نہیں۔ اب جو اسپین کے بادشاہ ہیں انکی شادی کے موقع پر اتنی بڑی روٹی تیار کی گئی تھی کہ ایک جہاز پر لاد کر بھیجی گئی تھی۔ ان روٹیوں کو "ویڈنگ کیک" کہتے ہیں۔

اناج کو ہاتھ میں لے کر دیکھو تو معلوم ہوگا۔ اس کے اوپر ایک چھلکا سا ہے۔ آٹے میں بھوسی اسی کی ہوتی ہے۔ آٹا پسنے کے بعد بھوسی کو چھان کر علاحدہ کر لیتے ہیں۔ اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی پکاتے ہیں۔

چکیاں پانچ قسم کی ہوتی ہیں:-

۱۔ ہاتھ سے چلتی ہے۔ اسے ہاتھ کی چکی کہتے ہیں۔

۲۔ بیل سے چلتی ہے۔ اسے خراس کہتے ہیں۔

۳۔ ہوا سے چلتی ہے۔ اسے پون چکی کہتے ہیں۔ یہ پون چکیاں پہاڑوں پر لگاتے ہیں۔ جہاں ہوا تیز ہوتی ہے ؀

۴۔ پانی کے زور سے پھرتی ہے۔ اسے پن چکی کہتے ہیں۔ انہیں کسی دریا یا چشمے کے کنارے پر بناتے ہیں ؀
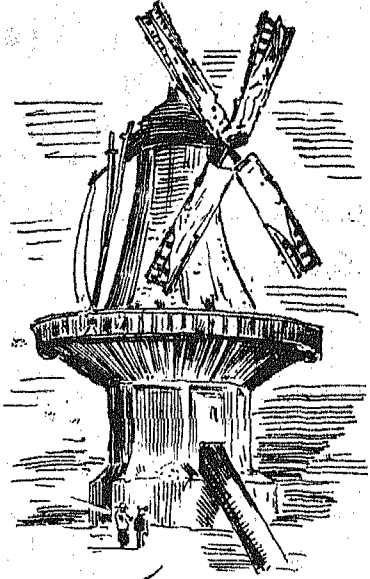
۵۔ انجن کے زور سے چلتی ہے۔ یہ بہت تیز چلتی ہے۔ اور اس میں آٹا بھی بہت پستا ہے ؀

پون چکی

اگرچہ دنیا کے اکثر حصوں میں روٹی زندگی کا سہارا ہے لیکن بنگال اور چین میں لوگوں کا گزارہ زیادہ تر چاولوں پر ہے ؀

سچ پوچھو تو "زندگی کا سہارا" چاول ہی کو کہنا سزاوار ہے۔ کیونکہ دنیا میں چاول کھانے والے روٹی کھانے والوں سے زیادہ ہیں ؀

چاول اکثر گرم ملکوں کی ترائی میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک زمین پر پانی کھڑا نہ ہے۔ چاول پیدا نہیں ہوتا۔ چاول کا درخت چاہتا ہے۔ کہ دن رات اس کے پاؤں پانی میں ڈوبے رہیں۔ اور سر دھوپ میں جلتا ہے جب چاول پک جاتا ہے۔ تو کھیت میں سے پانی نکال کر فصل کاٹ لیتے ہیں ؀

گلدستۂ مضامین داخل کورس پنجاب یونیورسٹی

---

(۶۰)

جانوروں کی بولی

قرآن شریف سے حضرت سلیمانؑ کی نسبت معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپؑ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ ایک مقام پر ہُدہُد کے ساتھ آپؑ کا مکالمہ درج ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ "آپ چیونٹیوں کی آپس میں باتیں سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑے"۔ ایک آیت میں آپؑ کا یہ قول موجود ہے کہ "ہمیں منطق الطیر (چڑیوں کی بولی) سکھا دی گئی ہے"۔

ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اکثر مفسرین تو بوجہ اپنی خوش اعتقادی کے (رحمۃ اللہ علیہم) محض سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔ اور انھوں نے یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان آیات کے الفاظ کا حمل اصلی معنوں پر ہے۔ یا یہ صرف استعارات ہیں۔ اور جو مفسر نقل وعقل کی تطبیق کا التزام کرتے ہیں۔ انھوں نے تاویل کر کے "منطق" سے مراد زبان حال لی ہے۔ کیونکہ اب تک عام خیال یہ تھا کہ مسلسل موضوع آوازوں کے ذریعہ سے ادائے خیالات پر صرف انسان قادر ہے لیکن اب سائنس دانوں نے جانوروں کی بولیاں سمجھنے کی باقاعدہ کوشش شروع کر دی ہے۔ اور وہ وقت قریب آگیا ہے۔ کہ آیات مذکورہ کی صحیح تفسیر ہو سکے

علمائے حیوانیات کا قول ہے۔ کہ جانور باہم اسی طرح بات چیت کرتے ہیں جس طرح انسان۔ مگر ہر نوع کے جانوروں کی بولیاں جدا ہیں۔ پھر ممکن ہے کہ جس طرح آب و ہوا اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ممالک کے انسانوں کی بولیاں جدا ہیں۔ اسی طرح مختلف ملکوں کے ہم نوع جانوروں کی بولیوں میں بھی کچھ اختلاف ہو۔ ان بولیوں میں گو سب کی سب بالکل ابتدائی اور بہت ہی بھونڈی شکل میں ہیں۔ مگر جانوروں کے مقاصد کے لئے یہ بخوبی مکمل ہیں۔ علما کا خیال ہے۔ کہ ادنے طبقہ کے جانور بھی اپنی خاص بولیاں رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جس جانور کے حلقوم ہے۔ وہ اس کا استعمال کرتا ہے مگر بہت سے جانور مثلاً چیونٹیوں اور دیمک وغیرہ کی

آواز ہنوز متحقق نہیں ہوئی، اگرچہ بلبل کی چہک اور گیدڑ کی ہوک ہمارے لئے بے معنی آوازیں ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ کوئی زبانیں ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک فصیح سے فصیح مقرر کی زبان نہ سمجھنے والے لئے اس کی تقریر ایسی ہی بے معنی ہوسکتی ہے۔

بولنے کے وقت جانوروں کی حرکات پر غور کرنے سے ان کے خیالات کا کچھ کچھ پتہ ضرور لگ سکتا ہے۔ مثلاً جس طرح انسان آواز دے کر اور پھر سر کا اشارہ کرکے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ اسی طرح گلگلین بھی کرتی ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ مینا (جو گلگل ہی کی نوع ہے) آواز دے کر سر سے بعینہ اسی قسم کا اشارہ کرتی ہے۔ جیسا گلگل کرتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم غور کریں۔ تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جن جانوروں کی بولیاں ہم سنتے رہتے ہیں۔ ان میں خوف، غصہ شدت مرض۔ بھوک۔ محبت۔ غرض مختلف جذبات کے اظہار کے لئے مختلف آوازیں ہیں؛

مگر جانوروں کی بولی سمجھنے کی کوشش کے لئے صرف مشاہدہ ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ آنکھ اور کان کو خارجی مدد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی بولی کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم اُسے بار بار سنیں۔ لیکن اس میں یہ دقت ہے کہ ہم کسی جانور سے ایک ہی آواز مطلوبہ مدت تک نہیں نکلوا سکتے۔ اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے محققین نے فونوگراف کا استعمال شروع کیا ہے یعنی کسی آواز کو فونوگراف میں بھر کر جی چاہے جتنی دیر تک سن سکتے ہیں لیکن اس میں بھی دقت ہے اور وہ یہ کہ جانوروں کی آواز بھرنا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب بہت سے جانور بول رہے ہوں۔ تو ایک کی آواز کو لینا باقی کو چھوڑنا محال ہے۔ اور آوازوں پر جدا جدا غور کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اس مشکل کو یوں حل کیا گیا ہے۔ کہ کسی خاص جانور کو سدھا اس کی آواز بھری جائے۔ گو اس کام میں چند در چند رکاوٹیں اور دشواریاں موجود ہیں۔ مگر دھن کے پورے لوگ ان سب کو اپنے سامنے سے ہٹاتے جاتے ہیں۔ اور منزل مقصود کے لگ بھگ پہنچ چکے ہیں؛

جانوروں میں چونکہ بندر کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھا گیا ہے اس لئے جانوروں کی بولی کا معلم اسی کو بنایا گیا ہے یعنی اول بندر کی بولی سیکھنے کی کوشش شروع کی گئی ہے۔ اس تحقیقات میں شکاگو (امریکہ) یونیورسٹی کے پروفیسر آر۔ ایل گارنر کا قدم سب سے آگے ہے۔ اس نے عرصہ دراز تک افریقہ کے سنسان اور گنجان جنگلوں میں رہ کر اور بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر بندروں کی بولی پر غور کیا ہے۔ اس نے یہ معلوم کر لیا ہے۔ کہ بندروں کی زبان صرف ۲۰ لفظوں سے مرکب ہے۔ انہی ۲۰ لفظوں سے وہ اپنی تمام ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان کا ایک ایک لفظ بہت سے متقارب خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً کھانے کی جتنی چیزیں ہیں۔ ان سب کا ایک نام ہوگا۔ خطرہ کی مختلف صورتوں کے ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی قسم کی آواز ہوگی۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

پروفیسر گارنر نے اس بولی میں یہاں تک ترقی کر لی ہے۔ کہ وہ بندروں کی بہت سی باتیں سمجھ سکتا ہے۔ اور چند الفاظ وہ ایسی صفائی سے بول سکتا ہے۔ کہ بندر اس کی اور اپنے ہمجنسوں کی آوازمیں کوئی تمیز نہیں کر سکتے۔ مثلاً بہت سے بندر جمع ہوں۔ اور پروفیسر ان کو انکی کی زبان میں خطرہ سے مطلع کرے۔ تو یقیناً تمام بندر بھاگ کر چھپ جائینگے۔ اور اگر ان کو کچھ کھانے کے لئے بلائے تو سب کے سب بھاگے آئینگے۔ غرض کہ جانوروں کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہو گیا ہے۔ انجام کا علم خدا کو ہے پانو فسریہ

۱۸

ماورای قبر کے پیغامات

مسلمانوں کا ایک گروہ کثیر (علی الخصوص ان کا فرقۂ صوفیائے کرام علیہم السلام) صدیوں سے اس بات کا قائل ہے کہ مُردوں سے روحانی فیضان حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مُردوں کے حالات معلوم کئے جا سکتے ہیں (جسے اصطلاح تصوف میں "کشف قبور" کہتے ہیں) مُردوں اور زندوں کے مابین گفتگو کا سلسلہ قایم ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ بعض لوگ درحقیقت مرتے نہیں۔ بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝

گو اب تک ان باتوں کو بہت سے آدمی مذاق میں اڑاتے رہے تھے لیکن اب جبکہ چند روز سے یورپ اور امریکہ کے علمائے روحانیات بھی بڑے زور سے ان دعاوی کی تصدیق کرنے لگے ہیں۔ غالباً بہت ہی کم لوگ نکلینگے۔ جو ان امور میں شک لانے کی جرأت کریں ؎ شبلی

نکتۂ شرع بافسانہ برابر نہی
یورپ ار گپ زند آں نیز مسلّم باشد

مُردوں سے گفتگو کا سلسلہ قایم کرنے میں جو قوم سب سے آگے ہے۔ وہ انگریز ہیں۔ خاص ہینوور اسکوئر لنڈن میں ۱۸۸۲ء میں ایک انجمن تحقیقات روحانیات (سوسائٹی فور سائکیکل ریسرچ) کے نام سے قایم ہوئی تھی جس کے ممبر نہایت سرگرمی کے ساتھ مُردوں سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان میں تین شخص سب سے زیادہ پرجوش تھے۔ جن کے نام ایڈمنڈ گرنی۔ ایف ایچ ڈبلیو مائرز اور ڈاکٹر رچرڈ ہاجسن ہیں۔ گرنی کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہوا۔ مائرز کا ۱۹۰۱ء میں۔ اور ہاجسن کا ۱۹۰۵ء میں مرنے سے پہلے یہ لوگ اپنی لگاتار تحقیقاتوں کے ذریعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ مردوں کے ساتھ گفتگو ہونا ممکن ہے۔ اور چونکہ اس زندگی میں ان کی دلی آرزو رہی تھی۔ کہ مردے زندوں سے باتیں کر سکتے اس لئے وہ اس

ارادہ کو اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ کہ مرنے کے بعد ہم خود زندوں سے گفتگو کرنی شروع کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے بعض لوگوں سے گفتگو کرنی کی کوشش کی ہے۔ جن میں قابل ذکر مسز ہالینڈ نامی ایک لیڈی ہے۔ جو ہندوستان میں بھی عرصہ دراز تک رہ چکی ہے ؛

ان لوگوں کا گفتگو کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ جس شخص سے یہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس کا ہاتھ خود بخود کچھ لکھنے لگتا ہے ؛

مائرز نے ایک اور لیڈی کو بتایا ہے کہ "میری فلاں کتاب میں فلاں غلطیاں ہیں۔" "روح غیر فانی ہے۔" "جو چیز ایک بار پیدا ہوگئی وہ ضائع نہیں ہوتی۔" "مادہ تغیر پذیر ہے۔" "ہمیشہ باقی رہنے والی نیکی خدا کی محبت ہے۔" "مردے محبت کے آرزومند ہوتے ہیں۔ رونے پیٹنے کے نہیں۔ مردوں کو رونا غلطی ہے۔"

ان روحوں کو باتیں کرنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں۔ وہ بھی انہوں نے بتائی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ "جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا۔ ہم میں طاقت نہیں ہے کہ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں۔ وہ سب تمہیں سمجھا دیں۔ ہماری تمہاری مثال ایسی ہے۔ کہ گہر پڑ سی رہی ہو۔ بیچ میں ایک دلدار شیشہ حائل ہو۔ جس کے پار نہ آواز جاتی ہے نہ نگاہ پورے طور پر کام کرتی ہے۔ اور پھر ایک شخص اس شیشہ کے ایک طرف سے اپنے سکرٹری کو کچھ لکھانا چاہے۔ جو شیشہ کے دوسری طرف ہے۔ یا جیسے کوئی سوتے ہوئے آدمی سے باتیں کرنی چاہے۔"

انگلستان کا مشہور اخبار نویس مسٹر ڈبلیو ٹی اسٹڈ ذاتی تجربات و تحقیقات کی بنا پر مُردوں کے ساتھ گفتگو کے امکان کا بڑا حامی ہے۔ ایک تجربہ کی کیفیت مسٹر اسٹڈ نے اس طرح لکھی ہے کہ "میں نے ایک لیڈی کو اس کی تحقیقات کے لئے اپنے ساتھ لیا اور قرار پایا۔ کہ ہم دونوں فلاں روز فلاں وقت اور فلاں فلاں مختلف مقامات پر بیٹھیں۔ اور فلاں فلاں لوگوں کی روحوں سے باتیں کرنے کی کوشش کریں۔ اور گفتگو کے الفاظ کو ایک ہی وقت

میں ایک دوسرے کے پتہ پر ڈاک میں ڈالیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ آدھ گھنٹہ تک مختلف امور پر گفتگو ہوئی۔ دونوں یعنی (مسٹر اسٹڈ اور لیڈی) کے پاس ۱۵ ادھکٹ جملے تھے۔ جن کا مفہوم مطلق نہ سمجھا جاتا تھا دونوں نے ان کو ایک دوسرے کے پتہ پر ایک ہی وقت میں ڈاک میں ڈال دیا۔ جب یہ الفاظ ایک دوسرے کے پاس پہنچے۔ اور ایک نے اپنے الفاظ کو دوسرے کے الفاظ کے ساتھ ملا کر پڑھا تو ان کو بالکل بامعنی پایا۔ اور ۱۵ میں سے ۱۱ جملوں کا مطلب بالکل حل ہو گیا۔ البتہ ۴ جملوں کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا جس کی یہ وجہ تھی کہ وہ امریکہ کے ایسے لوگوں کی نسبت تھے جن سے دونوں میں سے کوئی واقف نہ تھا۔"

جو لوگ مردوں سے گفتگو کے امکان کے منکر ہیں۔ ان کے سامنے مسٹر اسٹڈ یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ فرض کیجئے۔ کہ ابتدا میں جو لوگ یورپ سے امریکہ گئے تھے۔ وہ سخت بحری تلاطم یا کسی اور وجہ سے یورپ کو نہ لوٹ سکتے اور یورپ والوں کو ان کے نیک و بد کی کوئی خبر نہ ملتی۔ لیکن بے تار برقی خبر رسانی کی ایجاد کے بعد وہ یورپ والوں سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تو کیا اس کو جھٹلایا جا سکتا تھا۔ کہ واقعی یورپین تارکان وطن ہی امریکہ سے یہ پیغامات بھیج رہے ہیں ؛

غرض کہ جو مسئلہ مسلمانوں کے لئے بالکل پیش پا افتادہ ہے۔ اس کو جدید سائنٹفک طریقہ سے سمجھنے کے لئے یورپ اور امریکہ والے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ جس سے آئندہ اس حیرت انگیز مسئلہ پر بہت کچھ روشنی پڑنے کی توقع ہے ؛ (انو تحریر)

۶۲

قوت خیال کے عجائبات

بہت سے اصحاب واقف ہونگے۔ کہ اس زمانہ میں جو نئے علوم نکلے ہیں ان میں وہ علوم بھی ہیں۔ جن کو مسمریزم یا ہپناٹزم کہتے ہیں۔ ان کی نسبت میری رائے یہ ہے۔ کہ گو یہ علوم آج کل کی ایجاد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن در حقیقت یہ باد نےٰ تغیر وہی علوم ہیں جن کو پہلے سحر یا جادو یا نظر بندی یا ٹونا کہتے تھے۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ پہلے زمانے کے جادو یا سحر کا حلقہ نہایت تنگ تھا۔ اور اس کے جاننے والے بہت تھوڑے تھے۔ اور مسمریزم وغیرہ نسبتہً عام ہیں۔ اور ہر شخص ان کو سیکھ سکتا ہے۔ جب سے میں نے ان امور کی نسبت پڑھا۔ اور اپنے بعض واقف کار دوستوں سے سنا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ مسمریزم، ہپناٹزم، نظر بندی، سحر اور اسی قسم کی تمام دوسری چیزوں کا مخرج ایک ہے اور وہ "قوت خیال" ہے۔ میرے لئے اب نبیوں کے معجزات اور ولیوں کی کرامات ناقابل قیاس باتیں نہیں رہیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ کہ جس وہبی قوت سے کل حضرت عیسےٰ علیہ السلام اندھوں کو سوانکھا۔ کوڑھیوں کو چنگا۔ اور مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ بلاتشبیہہ اسی کسبی قوت سے ہپناٹسٹ اور مسمرسٹ آج کم از کم معمولی امراض کا ازالہ اور عامل اُن کو سلب کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ فرق ہے۔ کہ وہبی یعنی خداداد قوت اکمل و اعلےٰ تھی۔ اور اس وجہ سے اس سے بڑے بڑے کام ظہور میں آتے تھے۔ اور کسبی قوت چونکہ ناقص اور محض بطور رجارہ مستعار کے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس سے صرف چند معمولی اعمال سرزد ہوتے ہیں۔

میں نے یہ دعوےٰ کیا ہے۔ کہ معجزات اور کرامات۔ سحر اور نظر بندی مسمریزم اور ہپناٹزم یہ تمام ایک قوت خیال کے کرشمے ہیں۔ لہذا میں اپنے دعوے پر دلیل لانے کے لئے مختصراً چند امور عرض کرنے چاہتا ہوں۔ ہم پیغمبروں کی نسبت پڑھتے ہیں۔ کہ ان کے اندر ایک خاص قسم کے غودہ

کی عادت تھی۔ ہم صوفیوں کو دیکھتے ہیں۔ کہ وہ کس قدر ریاضت اور مجاہدہ
کرتے رہیں۔ اور تصور میں کیسے غرق رہتے ہیں۔ ہم عاملوں سے سنتے ہیں۔ کہ وہ
اکثر اوقات علی الخصوص عمل کے وقت مطلوب کا خیال جمانے کی کیسی تاکید
کرتے ہیں۔ علی ہذا مسمریزم وغیرہ کے بارہ میں ہم جانتے ہیں۔ کہ اس میں بھی
تصور اور خیال کے جمنے کو بہت کچھ دخل ہے۔ بلکہ اس کا مدار ہی تصور اور خیال
جمنے پر ہے۔ جس طرح صوفی حُسن مجازی کے ذریعہ سے حسن حقیقی سے متمتع ہوتے
ہیں۔ اسی طرح مسمرسٹوں اور ہپناٹسٹوں کو دیکھا گیا ہے۔ کہ ان کا معمول اگر
حسین ہے۔ تو اثر بہت جلد ہوتا ہے۔ کیونکہ حسین معمول کی طرف ان کے خیال
کی کشش آسانی سے اور زیادہ ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں سورۂ طٰہٰ کے اندر
جہاں فرعون کے جادوگروں اور حضرت موسےٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے مقابلہ
کا ذکر ہے۔ وہاں لکھا ہے وَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى
(یعنی ناگاہ ان (جادوگروں) کی رسیاں اور لاٹھیاں موسےٰ کے خیال میں اُن
(جادوگروں) کے جادو (کے زور) سے ایسی معلوم ہونے لگیں کہ گویا دوڑ رہی
ہیں) لیکن بالآخر موسےٰ کی قوت خیال (جو فی الوقت مغلوب ہو چلی تھی مگر
جس کے ساتھ خدا کے قادر مطلق ہونے کا اعتقاد شامل تھا آخر ان فرعون کی
شرک آلود قوت خیال پر غالب آئی۔ اور عصائے موسےٰ نے بڑا اژدہا بن کر ان
رسیوں اور لاٹھیوں کے سانپوں کو آن واحد میں نگل لیا۔ حضرت عمرؓ کی "یا
ساریۃ الجبل" والی حدیث بہت مشہور ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے۔ کہ ۲۱ھ
مطابق ۶۴۲ء میں جب کہ مسلمان نہاوند (ایران) کی فیصلہ کن جنگ میں مصروف
تھے۔ تو ایک جمعہ کو خطبہ کہتے کہتے حضرت عمرؓ یکایک زور سے چلانے لگے "یا ساریۃ
الجبل" یعنی اے ساریہ (اسلامی سپہ سالار) پہاڑ کی آڑ لو۔ آپ نے یہی جملے پے
در پے تین بار فرمایا۔ لوگ یہ ایک بے تعلق بات سن کر ایک دوسرے کا منہ تکنے
اور باہم سرگوشی کرنے لگے۔ فتح نہاوند کی خبر لے کر جب اس واقعہ کے ایک ماہ بعد
قاصد مدینہ پہنچا ہے۔ تو اس نے بیان کیا کہ فلاں تاریخ فلاں روز فلاں وقت
ہم لڑ رہے تھے۔ کہ کفار نے مسلمانوں کو نرغہ میں کر لیا۔ لیکن تین بار ایک آواز

آئی کہ پہاڑ کی آڑ لو۔ چنانچہ جب ہم پہاڑ کی آڑ میں آگئے۔ تو دشمن کا صرف ایک طرف سے مقابلہ رہ گیا۔ اور خدا نے ہمیں فتح دی۔ قاصد نے یہ بھی بتایا کہ یہ آواز حضرت عمرؓ کی معلوم ہوتی تھی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے ایسا خیال ہوا تھا۔ کہ ہمارے بھائی مسلمان شکست کھانے لگے ہیں۔ اس وجہ سے میری زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ خود حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں وقع فی خلدی یعنی میرے دل میں یہ بات آئی۔

اب قوت خیال کے چند عجائبات کا حال سنئے۔ اگر کسی تندرست آدمی کے خیال میں یہ بات جما دی جائے یا خود بخود جم جائے۔ کہ وہ بیمار ہے۔ تو ضرور بیمار ہو جائیگا۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ کہ "دوا ہمہ خلاق ہے" رحم دل طبیب مریض کی تشفی اسی لئے کیا کرتے ہیں۔ کہ مریض کی قوت خیال دوا کی معاون ہو جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے سانپ کے کاٹے کا علاج بھی قوت خیال کرتی ہے۔ تمام ذی شعور انسانوں کا یہ ایک معمولی تجربہ ہے کہ جس خاص حالت کا پیدا ہونا خاص قسم کے اثرات پر منحصر ہے۔ وہ خواب میں محض خیال کے ذریعہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مسمرسٹ پروفیسر کارفرما اس امر کا مدعی تھا کہ میں دو سو میل تک کی آواز بخوبی سن سکتا ہوں۔ اور اس نے بالکل معتبر ذرایع سے بارہا اپنے دعوے کی تصدیق کرا دی تھی۔ جن لوگوں کے دل کمزور ہوتے ہیں۔ ان کو تاریکی یا تنہائی میں جو مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ ان کی قوت خیال متشکل و مجسم ہو کر ان کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے ایک دوست؛ جن کو مسمریزم میں کچھ درک ہے، کہتے تھے کہ میں نے اپنے آپ کو بارہا اپنے قصد سے دوسروں کو خواب میں دکھایا ہے۔ میرے ایک اور ہپناٹسٹ دوست کہتے تھے کہ ایک بار میں نے ایک لڑکے پر عمل کیا اور اسکے ہاتھ پر آگ رکھ دی اور کہا یہ برف ہے۔ چنانچہ آگ کا مطلق اثر نہ ہوا لیکن جب دوسری جگہ برف کا چھوٹا سا ٹکڑا رکھا اور اسے آگ بتایا تو معمول نے فوراً ہاتھ جھٹک دیا اور سوزش کی شکایت کی اور طرفہ یہ کہ اس جگہ جہاں برف کا ٹکڑا آگ بتا کر رکھا گیا تھا آبلہ پڑ گیا۔ قوت خیال کے کرشموں کی مثالیں بہت سی ہیں کہاں تک بیان کی جائیں آئندہ اگر آپ اس قسم کی کوئی بات سنیں یا دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ محض قوت خیال کا کرشمہ ہے۔ (نو تحریر)

لیجئے